افکارِ محروم

تلوک چند محروم

ولادت : یکم جولائی ۱۸۸۷ء

وفات : ۶ جنوری ۱۹۶۶ء

افکارِ محروم

مرتّبہ

مالک رام

محروم میموریل کمیٹی

نئی دلّی

افکارِ محروم

مرتّب : مالک رام

مطبع : جمال پرنٹنگ پریس، دلّی

ناشر : محروم میموریل کمیٹی، نئی دلّی

ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دلّی، نئی دلی، بمبئی

قیمت : پانچ روپے

تعارف

جناب تلوک چند محرّوم کی وفات پر ایک برس گذر چکا ہے؛ ان کا انتقال ۶ جنوری ۱۹۶۶ء کو دلّی میں ہوا تھا۔ ان کے ادب دوست مدّاحوں اور نیازمندوں نے ان کی پہلی برسی پر خاص تقریب کا پروگرام بنایا، اور فیصلہ کیا کہ اسے محض رسمی جلسے تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ اس موقع پر محرّوم کے فکروفن سے متعلق صاحبِ نظر حضرات سے تقریریں کروائی جائیں، جس سے ہماری نئی نسل کو معلوم ہو کہ مرحوم کس پایے کے ادیب اور شاعر تھے اور اردو ادب کی تاریخ میں ان کا کیا مقام ہے۔ چنانچہ متعدد عنوان متعیّن کر کے مختلف اصحاب کو دعوت دی گئی کہ وہ اظہارِ خیال کریں۔ اس موقع پر جو مقالے قلمبند کیے گئے تھے، انھیں کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔

ان مقالات میں محرّوم کی نظم نگاری، غزل، رباعی، فارسی کلام، قومی شاعری، بچوں کی نظموں سے متعلق اختصار یا تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ فکر و نظر کی دنیا میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہو سکتی۔ ہر شعبے میں آئے دن نئے نئے گوشے اور زاویے اور پہلو نمایاں ہوتے رہتے اور دعوتِ نظارہ دیتے رہتے ہیں۔ کلامِ محرّوم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ یہ مجموعہ گویا نقطۂ آغاز ہے اس وسیع اور تفصیلی تبصرے کا جو محرّوم کی شاعری اور ادبی کارناموں کے لیے مقدّر ہو چکا ہے۔ مستقبل کے نقاد ان بنیادوں پر قصرِ فلک بوس تعمیر کرتے رہیں گے۔

ہمارے ملک کے جو حالات ہیں، انھیں پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہی خیال ہوتا ہے کہ اس ملک کی نجات اسی میں ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں سیکولر نظریے کو اپنا شعار اور مسلک بنالیں۔ مذہب یا دھرم شخصی اور ذاتی چیز ہے؛ یہ واسطہ ہے انسان اور اس کے خالق کے درمیان؛

یہ انسان کو اچھا بیٹا، اچھا بھائی، اچھا شوہر، اچھا باپ، اچھا شہری — غرض ایک اچھا انسان بننے میں مدد دیتا ہے۔ اسی لیے یہ بہت ضروری بھی ہے۔ ایسے میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے سے محض اس لیے دشمنی یا مخالفت یا نفرت کرے کہ اس کے مذہبی معتقدات اس سے مختلف ہیں۔ محروم کا کلام اس لحاظ سے مشعلِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ انھوں نے جس خلوص اور وسعتِ نظری سے تمام مذاہب کے بانیوں اور پیشواؤں کی مدح کی ہے اور ان کی خوبیوں کو اُجاگر کیا ہے، یہ ان کا قابلِ تقلید کارنامہ ہے۔

محروم کو ہم سے جدا ہوئے کوئی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں، اسی لیے ہم ان کی عظمت کا ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کسی رفیع الشّان چیز کی عظمت و جلال کا صحیح اور مکمل ادراک اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک آپ اس سے کافی دور پیچھے ہٹ کر اس کا نظّارہ نہ کریں۔ اہرامِ مصر کے ہیبتناک حجم اور حسن کے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ انھیں کافی فاصلے سے دیکھیں۔ اگر آپ عین اُن کے قریب یا سایے میں کھڑے ہو کر انھیں دیکھینگے، تو اس سے محروم رہینگے۔ تاریخی واقعات اور بڑی شخصیتوں پر بھی یہی کلیّہ صادق آتا ہے۔

مالک رام

فہرست

محروم کی نظمیں

از

راجندر ناتھ شیدا

ایم اے

راجندر ناتھ شیدا

محرومؔ کی نظمیں

پروفیسر تلوک چند محرومؔ جن کے انتقال کو تقریباً ایک سال ہوا، اردو کے ان ممتاز شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ادب کی خدمت میں صرف کیا، موجودہ صدی کے قریب قریب آغاز ہی کے ساتھ ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب سے لے کر وفات سے کچھ ہی پہلے تک وہ برابر شعری ادب میں اضافہ کرتے رہے۔ کم وبیش ساٹھ سال کے اس طویل عرصے میں اردو شاعری کا کارواں کئی منزلوں سے گزرا؛ راہ میں متعدد نشیب و فراز آئے، نئی نئی تحریکیں ابھریں اور دب گئیں۔ شاعری ماحول کے اثرات کو اپنے دامن میں سمیٹتی، بھرتی، جدید وقدیم کی آویزشوں میں الجھتی اور آمیزشوں سے تقویت حاصل کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ محرومؔ کی نظریں بھی زندگی اور ادب کی ادلتی بدلتی قدروں پر پڑیں اور ان کے ذہن نے حسبِ استعداد وقت کے تقاضوں کو قبول کیا۔

یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ اس صدی کے ابتدائی دور میں ہماری قومی زندگی پر مغربی حکومت اور تہذیب وتمدن کے گہرے اثرات پڑ رہے تھے جس سے فکر وعمل کے نئے سوتے پھوٹتے جاتے تھے۔ زندگی کے کسی بھی پہلو پر نظر ڈالیے، وہ مذہبی ہو یا سیاسی، معاشی ومعاشرتی ہو یا تعلیمی اور علمی، خود ادب ہی کو دیکھ لیجیے، ہر طرف اصلاح کا ذوق وشوق کارفرما نظر آتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کسی "آفتابِ تازہ" کی تپش سے قدامت کا برفستان پگھل کر ہمہ گیر اصلاح کا دریا بن گیا ہے جو مختلف راستوں سے بہتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ راہ میں

رکاوٹیں بھی ہیں، جن سے ٹکرا کر اس کے دھارے اپنے بہاؤ کے رخ ادلتے بدلتے بھی رہتے ہیں لیکن پھر وہ سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور اپنی مخصوص سمت میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

غرض وقت کا یہ بہاؤ، قومی زندگی میں فکر و عمل کی یہ حرکت تھی یا یوں کہیے، جدید و قدیم کی یہ کشمکش تھی جس میں محروم کی نوجوانی نے آنکھیں کھولیں اور جس کے اثرات کو ان کے ذہن نے اپنے اندر جذب کیا۔ اس لیے ان کی نظموں میں قدم قدم پر ہمیں ان اثرات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

فرانسیسی مفکّر اور نقّاد ٹین (Taine) کا خیال ہے کہ ادب ہر صورت میں ہمعصر قومی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے؛ لیکن ادب کی تخلیق میں ادیب کی شخصیت اور روایات کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے کسی ادیب کی تخلیقات کو اچھی طرح سمجھنا ممکن نہیں۔ شاعر کے شعور کو جاننے کے لیے اس کی ہمعصر تحریکات اور رجحانات کا جاننا تو ضروری ہے ہی، ساتھ ہی اس کے ذاتی ماحول، تعلیم و تربیت اور افتادِ طبع کا علم اور قومی و ادبی روایات سے واقفیت بھی ناگزیر ہے۔ ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کا ذہن عموماً تیس سے چالیس سال کی عمر تک بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ اسی زمانے کی ذہنی کیفیت اس کی شخصیت کی بنیاد بنتی ہے۔ آئندہ زندگی کے واقعات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو اس کا نقطۂ نظر وہی ہوتا ہے جو تیس سے چالیس سال کی عمر میں پختہ ہو کر ذہن میں جاگزیں ہو چکا ہے۔ اس لیے ہمیں کسی شاعر سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ بعد کے حقائق کی روشنی میں اپنے محسوسات میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کرے گا۔

پروفیسر محروم کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کی زندگی کے کچھ واقعات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ وہ ۱۸۸۷ء میں ایک متوسط ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن مغربی پنجاب میں ضلع میانوالی کا ایک قصبہ عیسیٰ خیل تھا جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ محروم نے ایک نظم "محروم کا وطن" میں اپنے وطن کا ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصبہ جس

علاقے میں واقع ہے وہ اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے پسماندہ ہے۔ لوگوں کو ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ قصبے میں میٹھا پانی تک نایاب ہے جس کی وجہ سے عورتیں میلوں سے پانی کے مٹکے اپنے سروں پر رکھ کر لاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ڈاکوؤں اور درندوں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ اس نظم کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں مبالغہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ ممکن ہے، اب حالات کچھ بدل گئے ہوں، لیکن محروم کے ذہن کی جس ماحول میں تربیت ہوئی، وہ یہی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے علاقے کے لوگ عموماً سیدھے سادہ اور جفاکش ہوتے ہیں، ان کے دل چھل کپٹ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ ان میں خلوص، قناعت، راست روی اور جرأت مندی ہوتی ہے۔ محروم کی تعلیم اور پرورش اسی ماحول میں ہوئی۔ ان کی طبیعت میں سنجیدگی اور شعری تخلیق کی صلاحیت تھی چنانچہ اردگرد کے حالات نے انھیں سادہ مزاج، قانع، مخلص اور ایثار دوست انسان بننے میں مدد دی۔ ایک تو یہ ماحول یوں بھی مذہبی اور اخلاقی تھا، اس پر انھوں نے فارسی ادب پڑھا اور تعلیم کا پیشہ اختیار کیا جس سے ان کے ذہن پر مذہبی، اخلاقی اور روحانی قدریں مسلط و مستحکم ہو گئیں۔

اب رہے ملک اور قوم کے عام حالات، ان کا بیان تفصیل چاہتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مگر یہ حالات پروفیسر محروم کے ذہن پر کس طرح اثرانداز ہوئے، یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ اس لیے مختصراً یوں سمجھیے کہ اس صدی کے شروع میں جب وہ عمر کی اُس منزل سے گزر رہے تھے جب ذہن سماجی ماحول کے اثرات قبول کرنا شروع کر دیتا ہے، ہندستان مضبوطی کے ساتھ حکومتِ برطانیہ کے چنگل میں تھا۔ یوں تو ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی سیاسی اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا اور شاہِ دہلی کی حیثیت شاہِ شطرنج کی سی تھی، لیکن بغاوت کے فرو ہونے کے بعد تو رہا سہا قصہ بھی پاک ہو گیا۔ بغاوت میں سب سے اہم رول جن طبقوں نے ادا کیا تھا وہ تھے والیانِ ریاست، جاگیردار اور مذہبی علماء۔ اس آخری شکست سے اُن کے بھی حوصلے پست ہو گئے۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ والیانِ ریاست اور جاگیرداروں نے حکومتِ وقت کی اطاعت میں مصلحت

دیکھی اور مذہبی طبقے کے وقار میں کمی ہونا شروع ہوگئی۔ غرض یہ طبقے حکومت کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہے۔

اسی زمانے میں کچھ نئے طبقے اور نئی تحریکیں اُبھریں، مذہبی اصلاح کی کچھ تحریکیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ۱۸۵۷ء سے پہلے سے موجود تھیں۔ اب اس رجحان کو اور تقویت حاصل ہوئی۔ غرض دونوں مذاہب میں اصلاح کی نئی نئی تحریکیں نمودار ہونے لگیں۔ یہ تحریکیں داخلی اور خارجی محرکات کے عمل اور ردِ عمل سے ظہور میں آئی تھیں۔ نہ تو یہ کلیتہً مغربی اثرات کا نتیجہ تھیں، نہ خالص قومی نظریات کا۔ یہ بدیہی طور پر مغرب کی ہمعصر فکری سطحوں کو نہیں چھو سکتی تھیں۔ انھیں زیادہ سے زیادہ جدید اور قدیم کے درمیان ایک سمجھوتہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا جہاں انھوں نے اپنے مذاہب کی مفروضہ قدیم صورتوں کی صداقت اور افادیت پر زور دیا اور شدّ و مد کے ساتھ ان کی حمایت کی، وہیں کچھ ایسے عقائد کی جو بظاہر غیر معقول اور مضر تھے، مخالفت بھی کی۔ کہا یہ کہ ان باتوں کا نفسِ مذہب سے کوئی تعلق نہیں، یہ محض الحاقی چیزیں ہیں، یہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مذہب میں شامل ہو گئی تھیں۔ انھیں محض توہمات کہہ کر مذہب سے خارج کرنے کی کوشش کی گئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد مذہبی حالات کی طرح سیاسی منظر بھی بدلا۔ جاگیرداری کی شکست پر سیاسی قیادت نئے ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے ہاتھ میں آگئی۔ جس نے مغرب کی لبرل ازم، وطنیت اور قومیت کی تحریکوں سے روشنی حاصل کر کے آئینی اصلاح کے مطالبات پیش کیے۔ نو آبادیاتی نظام میں حاکم و محکوم کا امتیاز، عام افلاس، صنعتی، تجارتی اور تمدنی پس ماندگی، ان اور ایسی ہی اور باتوں نے سیاسی جدوجہد کو ہوا دی، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور پھیلتی گئی۔ اس سلسلے میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اس دور میں برطانوی حکومت خود ایک عجیب و غریب تہذیبی تضاد کا شکار تھی۔ جہاں برطانیہ کے مفکر سیاسی، اقتصادی، مذہبی، سماجی غرض زندگی کے ہر شعبے میں لبرل ازم کا جھنڈا بلند کر رہے تھے نو آبادیات میں انھی رجحانات کے خلاف ان کی قومی حکومتوں کو نبرد آزما ہونا پڑتا تھا، جو ان کی اخلاقی قوت کے لیے ایک زبردست چیلنج تھا اور ہندستان میں ان رجحانات

کے حاملوں کے لیے روحانی تقویت کا سرچشمہ۔ اس کے علاوہ یورپ میں ماضی کی کھوج کا شوق ہندوستان میں کلاسیکی ادبوں کے مطالعے اور ماضی کے دھندلکوں کو روشن کرنے میں ممدّو معاون ثابت ہوا۔ چنانچہ مغرب میں تہذیب وتمدّن کی ترقی کے دعووں کے ردِّ عمل میں یہاں بھی اپنے ماضی پر فخرو مباہات کے جذبات ابھرے اور قومی شعور کا حصہ بن گئے۔ انھوں نے سیاسیات کو بھی متاثّر کیا۔ سیاسی جدوجہد کو تقویت پہنچائی، مگر اس کے رخ کو مختلف سمتوں میں موڑ دیا جس سے بعد کو پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں۔ بہر کیف اس سے قومی شعور میں مذہبی اور روحانی عناصر اور بھی بڑھ گئے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ اس دور کی اکثر اصلاحی تحریکوں نے، وہ کسی طرح کی کیوں نہ ہوں، یا تو متوازی تعلیمی تحریکیں چلائیں یا اپنے فروغ کے لیے تعلیم کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ وجہ ظاہر ہے یہ لوگ قوم کے بچوں اور نوجوانوں میں اپنے مقاصد کی اشاعت کو ضروری سمجھتے تھے کیوں کہ آخر انہی پر آئندہ ان تحریکوں کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار تھا۔ اب رہا ادب، تو جن مقاصد کے لیے تعلیم استعمال میں آسکتی تھی، ان کے لیے ادب بھی ایک موثّر ذریعہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ جب ہم اس دور کے ادب پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں اس میں اصلاح اور کردار سازی کی یہی روح ہر طرف سرایت کیے ہوئے نظر آتی ہے۔ ادب کی کوئی صنف نہیں جو اس سے متاثر نہ ہو، کوئی کم کوئی زیادہ۔

اردو شاعری پر نظر ڈالی جائے، تو اس سے بھی اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نظمیں تو اردو میں ایک مدت سے لکھی جا رہی تھیں لیکن نظم نگاری کے جدید دور کا آغاز "انجمن پنجاب" کے قیام کے ساتھ ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد ہی شاعری میں اصلاح تھا۔ بقول حالؔی شاعری کو عشق و مبالغہ سے نجات دلا کر اُسے وسعت دینا اور اس کی بنیاد حقائق اور واقعات پر رکھنا تھا۔ آزادؔ، حالؔی اور ان کے معاصرین جو جدید اردو نظم کے بانی تصور کیے جاتے ہیں، مغربی شاعری سے ناواقفیت کی وجہ سے اپنی شاعری کو مغربی سانچوں

میں تو نہیں ڈھال سکتے تھے لیکن وہ اردو شاعری کو کچھ بدعتوں سے پاک کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ اس کا اثر غزل پر بھی پڑا لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نظم کو خاص طور پر موزوں سمجھا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس تحریک کا باہری ڈھانچہ خارجی اثرات اور کرنل ہالرائڈ کی مساعی کا مرہونِ منت ہے، لیکن اس کا ضمیر داخلی ہے کیونکہ شاعری کی اصلاح جس صورت سے عمل میں آئی وہ خود اردو شاعروں کے ذہنوں کی پیداوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی اردو شاعری اپنی روایات سے بالکل منہ موڑ کر نہیں چلتی بلکہ انھی روایات میں سے نکلتی اور ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میں اجنبیت اور غرابت بھی بہت کم ہے۔

جدید اردو شاعری کے عَلَم برداروں کے پیشِ نظر دو باتیں تھیں، ایک منفی اور ایک مثبت۔ وہ روایتی شاعری کی کچھ باتوں کو معیوب سمجھ کر انھیں ترک کرنے کے حامی تھے اور کچھ باتوں کو شعوری طور پر رائج کرنے کے۔ روایتی شاعری کی جن باتوں کو ترک کرنا چاہتے تھے، ان میں اصلیت سے بعید باتیں اور لایعنی تخیل شامل ہیں۔ مبالغہ اور استغراق بھی اسی ضمن میں آتے ہیں اور ایسے صنائع بدائع کا استعمال بھی جو شعر کے معنی میں کوئی اضافہ یا حسن نہ پیدا کرتا ہو۔ اب رہا جدید شاعری کا مثبت پہلو، تو اس میں شاعری میں واقعیت کا خیال رکھنا یا اسے حقیقت سے قریب لانا، سیدھے سادہ مگر پُر اسرار طریقے سے بات کہنا، شاعری کو اخلاقی اور روحانی تعلیمات اور قومی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرنا اور ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر مناظرِ قدرت کی تصویریں پیش کرنا شامل ہے۔ غرض یہ تنقیدی اور افادی نقطۂ نظر تھا جس نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی یا دوسرے لفظوں میں جس کی روشنی میں مروّجہ شاعری کی اصلاح عمل میں آئی۔ اس سلسلے میں کیا کچھ ہوا؟ کس حد تک ہوا؟ ایسا ہونا کہاں تک درست تھا؟ یہ سب تفصیلات کی باتیں ہیں جنھیں سرِدست نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

رہی بات ہیئتِ شعر اور اصنافِ سخن کی تو جس طرح اس دور میں دوسری کچھ چیزیں ابھریں کچھ دبیں، کچھ کی اہمیت گھٹی، کچھ کی بڑھی، اسی طرح جاگیرداری اور روایتی مذہب کے انحطاط کے

سبب سے قصیدے اور سلخاتِ کربلا سے متعلق مرثیے کا زوال بھی شروع ہوگیا۔ جدید موضوعات پر مختصر نظمیں ان کی جگہ لیتی چلی گئیں جو زیادہ تر مثنوی، مسدس، قطعہ وغیرہ کی فارم میں لکھی جاتی تھیں۔ پہلے غزل مقبول ترین صنفِ سخن تھی۔ اب نظم غزل سے زیادہ اہم ہوگئی کیونکہ نظم نے نئے دور کی پیغامبری کی اور ایسا کرنے کی وہ غزل کی نسبت زیادہ صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ چونکہ یہ جدید شاعر اپنے فن کو قوم کے اخلاقی اور سماجی سدھار کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے، دلائل دے کر یا قصے کہانیاں بیان کر کے کچھ باتیں سمجھانا اور ذہن نشین کرانا چاہتے تھے اس لیے اُن کے اسلوبِ بیان میں جذباتیت اور اثر آفرینی کو اور ٹکنیک میں بیانیہ، خطیبانہ اور مکالمانہ عناصر کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔ ویسے نئی اصناف کے اخذ و اختراع کو ان شاعروں نے بہت ضروری نہیں سمجھا۔ مروّجہ اصناف میں کچھ معمولی سے تغیر و تبدل پر اکتفا کی۔
اب محروم کی شاعری کو ان حقائق اور واقعات کے پس منظر میں رکھ کر دیکھیے، تو اس کے تمام خد و خال نمایاں ہو کر سامنے آجائیں گے۔ مذہب، روحانیت اور اخلاقیات میں اُن کی دلچسپی، اُن کے دل میں قوم و وطن کا درد، اُن کی وسعتِ نظر، خانگی زندگی سے پیدا ہونے والا سوز و گداز، مظاہرِ قدرت پر ان کے مخصوص تاثرات، اور اہلِ قوم کو خصوصاً نوجوانوں کو ایثار و عمل کی تلقین کا ذوق، بچوں میں دلچسپی، غرض ان کے فکر و شعور کا کوئی گوشہ روشنی میں آئے بغیر نہیں رہے گا۔ ساتھ ہی ان کے فکری محرکات کا باہمی رابطہ اور شاعری میں گوناگوں صورتوں سے ان کا اظہار ایک منطقی نتیجہ اور حقیقت بن کر نظر کے سامنے آسکے گا۔

پروفیسر محروم مذہب اور روحانیت کے قائل تھے۔ اس زمانے میں ہر شخص کے دماغ پر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا کوئی اور، مذہب کی گہری چھاپ تھی؛ روحانیت میں ہر شخص کا اعتقاد تھا۔ کچھ تصورات جو سینکڑوں برس سے ذہنوں میں جاگزیں تھے غیر مشتبہ حقیقت اور اعتقاد کی صورت اختیار کر چکے تھے ہر آدمی کو دنیوی زندگی کے مسائل کے ساتھ آخرت کی فکر بھی رہتی تھی اور آخرت کی کھیتی دنیا تھی، جسے مروّجہ مذہبی تعلیمات کے ذریعہ بویا جا سکتا تھا۔ مذہب اور

روح کا چولی دامن کا ساتھ ہے چنانچہ روحانیت کے مروّجہ تصوّرات بھی عقیدوں کی صورت اختیار کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح روح کی طہارت اور نیکیِ فکر و عمل لازم و ملزوم ہیں۔ مذہب کی رو سے یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ محروم کا ذہن اس صدی کی دوسری دہائی تک بالغ ہو چکا تھا۔ اس نسل کے تقریباً تمام ہندوستانی مفکّر ان چیزوں میں اعتقاد رکھتے تھے اور انھیں مسلّم حقیقتیں تصور کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے قریب سے البتہ کبھی کبھی ان "حقیقتوں" کو شبہہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، محروم اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں ذہن ایسے معاملات میں نئے اثرات قبول کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے اس لیے ان کے شعور میں ایسے اثرات کو تلاش کرنا بے سود ہو گا۔

محروم ایک عام ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کے عقائد بھی ایک عام ہندو کے سے ہیں۔ لیکن ایک بات قابلِ توجہ ہے ان کا مشرب بہت وسیع ہے ان کے دل میں ہر مذہب کے بزرگوں کا احترام ہے اور وہ ہر مذہب کے محاسن کو پیشِ نظر رکھنے اور معائب کو نظر انداز کرنے کے قائل ہیں۔ مذاہب کو پرکھنے کا یہ طریقہ خالص علمی نہ ہو کر بھی طہارتِ نفس کا مظہر ضرور ہے۔ دراصل اس کی تہ میں عقائد کی نزاعی باتوں کو پسِ پشت ڈال کر مشترکہ زمین تلاش کرنے کا جذبہ ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جس کا اظہار رومی نے ان الفاظ میں کیا ہے

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

اس کے علاوہ یہ نظریہ مختلف مذاہب میں اعلیٰ قدروں کی یک رنگی پر زور دیتا اور ہمہ گیر انسانی محبت کا درس دیتا ہے۔ یہ ہندستان کے کچھ سنتوں اور صوفیوں کے عقائد سے مطابقت رکھتا ہے جس کا گاندھی جی کے ذہن پر بھی بڑا گہرا اثر تھا۔ اور ظاہر ہے کہ محروم گاندھی جی کی تعلیمات سے بھی متاثر تھے۔

پروفیسر محروم کی نظموں کے مجموعے "نیرنگِ معانی" میں "چراغِ راہ" کے عنوان سے ایک الگ

باب ہے جس میں بانیانِ مذاہب اور ہادیانِ دین سے متعلق نظمیں شامل ہیں۔ اس میں پیغمبرِ اسلام، حضرت علی، حضرت امام حسین، حضرت عیسیٰ، گورونانک، گوروگوبند سنگھ، رام کرشن، سوامی رام تیرتھ اور مہاتما ہنسراج کی سیرت اور تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے؛ عام طور پر اُن کی زندگیوں سے متعلق روایات سے واقعات انتخاب کر کے انھیں نظم کیا گیا ہے۔

یہ خیال کہ کسی کا مذہب کچھ بھی کیوں نہ ہو، ہر انسان دوسرے انسان کی ہمدردی کا مستحق ہے، محروم کی ایک نظم "سیرتِ نبوی کی ایک مثال" میں بڑے ڈرامائی اور مؤثر پیرایے میں ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے۔ حضرت محمد ایک مسجد میں بیٹھے ہیں۔ سامنے سے ایک یہودی کا جنازہ آتا ہے۔ اس پر آنحضرت تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صحابہ حیران ہیں، سمجھ نہیں سکتے کہ مشرک کے مردے کی تعظیم کیوں کی گئی۔ پوچھتے ہیں۔ اس پر جواب ملتا ہے:

یہ فرمایا: مجھے معلوم ہے، وہ نامسلماں تھا
میسّر ہو سکی اس کو نہ توفیقِ خدا جوئی
مگر اس بات سے انکار ہرگز ہو نہیں سکتا
اُسی جان آفرینِ پاک کی تخلیق تھا وہ بھی

اسی طرح کی ایک اور نظم ہے "مرہمِ شفا": گوروگوبند سنگھ آنندپور میں دشمن سے نبرد آزما ہیں۔ گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ میدانِ جنگ میں ایک شخص ہے "بھائی کنھیا"۔ یہ دوست دشمن میں تمیز کیے بغیر ہر زخمی کو پانی پلا رہا ہے۔ کسی کو اس کا دشمنوں کو پانی پلانا ناگوار گزرتا ہے۔ آخر اُسے گوروگوبند سنگھ کے روبرو پیش کیا جاتا ہے۔ گورو جی اس سے جواب طلب کرتے ہیں، تو وہ عرض کرتا ہے: "گر ہے خطا تو دیدۂ یک بیں کی ہے خطا"، اور یہ بھی کہتا ہے: "کی ہے حضور ہی نے جسے یہ نظر عطا"۔ یہ سُن کر گوروگوبند سنگھ اس کی نیک عملی کے

قائل ہو جاتے ہیں اور اس سے خوش ہو کر اس کے پانی کو "مرہمِ شفا" کے مقدس نام سے پکارتے ہیں۔

ایسی نظموں میں محروم کی عالم گیر انسان دوستی کا پاکیزہ جذبہ صاف جھلکتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ زندگی کی گتھیاں محض نیک جذبات کے ناخنوں سے نہیں سلجھتیں۔ مسائلِ حیات بڑے پُرپیچ ہیں انھیں حل کرنے کے لیے بڑی بصیرت اور انتھک عملِ صالح کی ضرورت پڑتی ہے۔

محروم کا مزاج "بے ہمہ شو، باہمہ باش" کا سا تھا۔ اُن کی روح کو دنیا کے تعلقات اور معاملات میں دلچسپی تھی بھی اور نہیں بھی۔ وہ دنیا میں سکون اور محبت تلاش کرتے تھے، اس کے لیے جہد و عمل کے قائل تھے لیکن جب وہ اہلِ دنیا کو خود غرضانہ بھاگ دوڑ میں مصروف دیکھتے تھے، لوگوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجشیں اور آویزشیں، فریب و ریاکاری اور ظلم و ناانصافی دیکھتے تھے، تو ان میں اکتاہٹ پیدا ہوتی تھی اور وہ ان ہنگاموں سے دور بھاگ کر کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہنے کی تمنا کرنے لگتے تھے اور کہتے تھے:

دنیا میں بہت دوڑے — راحت کے تمنائی
تسکیں کی مگر صورت — تجھ میں ہی نظر آئی
اے گوشۂ تنہائی

یہ جذبہ کبھی کبھی اتنا شدید ہوتا تھا کہ وہ انسان کو سخت سُست کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ سب تصویر کا محض ایک رُخ ہے اس تصویر کا دوسرا رُخ ہے انسان کو بہتر بنتے دیکھنے، اُس کی زندگی میں راحت و مسرت بڑھتے دیکھنے کی تمنا؛ زندگی سے غلامی، افلاس، ناانصافی، عداوت اور ظلم کو مٹتے دیکھنے کی تمنا اور انسانوں کو ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے بے خوفی سے جدوجہد کرتے اور ہر ممکن قربانی دیتے دیکھنے کی تمنا۔ محروم کا شعور جس دور میں بن کر اپنی مخصوص صورت اختیار کر رہا ہے اس میں یہ تمنائیں روحانیت اور

سیاسیات کے ڈانڈے ملا رہی تھیں۔ قوم آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ خیال تھا کہ سیاسی غلامی تمام خرابیوں کی جڑ ہے جس کو اکھاڑ پھینکنا ہر ہندستانی کا مذہبی اور اخلاقی فرض ہے۔ اس لیے جب ہم دیکھتے ہیں کہ پروفیسر محرؔوم کو اپنے ان گنت ہم وطنوں کی طرح قومی سیاسیات کی شورش اور ہنگامہ خیزی میں بھی دلچسپی ہے، تو یہ کوئی تعجب کی بات معلوم نہیں ہوتی، اس میں کوئی تناقص نظر نہیں آتا۔

پروفیسر محرؔوم نے آزادی کے لیے ہمعصر جدوجہد کو جس نظر سے دیکھا، اُس کی جھلکیاں اُن نظموں میں نظر آئیں گی جو اُن کے مجموعے ”کاروانِ وطن“ میں شامل ہیں۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۶۰ء تک کی اِن نظموں میں قومی سیاسیات کے اتار چڑھاؤ پر شاعر کے تاثرات ان میں موجود ہیں۔ صدیِ حاضر کی دوسری دہائی کے آخری سالوں میں اشتراکیت کی جو آواز ملک کی فضا میں گونجنے لگی تھی، وہ البتہ ان نظموں میں سنائی نہیں دیتی اور نہ ہی ان میں اُس وقت کے نوجوانوں کی وہ تڑپ نظر آتی ہے جو روایتی مذہب اور اخلاق کی حدوں کو عبور کر کے اپنے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ وجہ ظاہر ہے، اس وقت تک محرؔوم کے احساسات پختہ ہو چکے تھے۔

اب ان نظموں کو لیجیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی زمانے کی نظموں میں زیادہ تر وطن سے جذباتی لگاؤ، دورِ حاضر میں قوم کی زبوں حالی اور ماضی کی عظمت کا احساس نیز مستقبل میں ترقی کے لیے تحریک اور ایسے ہی جذبات قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔ ان میں کوئی نظم حاؔلی کی ”مدوجزرِ اسلام“ اور کیفؔی کی ”بھارت درپن“ کی طرح طویل تو نہیں ہے اور نہ اُن میں قومی عروج و زوال کی ان کی ایسی تفصیلات ہیں، لیکن جذبات عموماً وہی ہیں۔ اس کے بعد شاعر کی نظر میں اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے دل میں قومی رہنماؤں کی ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے قربانیوں کی قدر اور ان کے لیے احترام کے جذبات اُمڈتے ہیں۔ وہ ظفر، گوکھلے، تلک، گاندھی اور اجمل خاں وغیرہ کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے اور گوناگوں ہمعصر واقعات

پر ایک وطن پرست کی حیثیت سے اظہارِ خیال کرتا ہے۔ سودیشی تحریک اور افریقہ میں گاندھی جی کی قیادت میں ہندوستانیوں کی جدوجہد سے لے کر محرومؔ نے گاندھی جی کے قتل اور بھودان کی تحریک تک نہ جانے کتنے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔

افریقہ میں ہندوستانیوں کی جدوجہد پر چکبستؔ کی نظم "فریادِ قوم" بہت مشہور ہے، ایسے ہی کچھ جذبات کی حامل محرومؔ کی نظم "جنوبی افریقہ کے مظلوم ہندوستانی" ہے۔ ان دونوں نظموں میں افریقہ میں ہندوستانیوں کی پریشان حالی پر اظہارِ غم، گاندھی جی کے ایثار اور قیادت کو خراجِ تحسین، اور وہاں کے مقامی حکام کے ظلم و ستم کے خلاف حکومتِ برطانیہ سے فریاد موجود ہے، اس مفروضے کی وجہ سے کہ یہ سب کچھ انہی حکام کی شرارت اور فرعونیت کا نتیجہ ہے، جسے برطانوی حکومت کی رعایا پروری اور انصاف پسندی برداشت نہیں کر سکتی۔

محرومؔ کہتے ہیں:

گورنمنٹ سے فریاد اب ہماری ہے
کہ اے وطن کے مددگار نگاہدارِ وطن!
یہ خواہ مخواہ کی ہم سے کدورتیں کیسی
اڑائے دیتے ہیں اغیار کیوں غبارِ وطن

محرومؔ نے لالہ لاجپت رائے کی جلاوطنی اور اُن کی اور مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی رہائی، جلیاں والا باغ کا خونیں واقعہ، تحریکِ خلافت، فرقہ وارانہ فسادات، سائمن کمیشن، بھگت سنگھ کو پھانسی لگنا، گاندھی جی کی بھوک ہڑتال، گول میز کانفرنس، کمیونل اوارڈ، دوسری جنگِ عظیم اور اس کی تباہ کاریاں، قحطِ بنگال، آزاد ہند فوج، تقسیمِ ہند اور اس سلسلے میں خونیں ہنگامے، جفاکاری اور سفاکی، گاندھی جی کی شہادت اور جشنِ آزادی ایسے موضوعات پر بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ چکبستؔ کی طرح انھوں نے

بھی سیاسی رہنماؤں کی وفات پر مرثیے لکھ کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ایسے رہنماؤں میں گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگادھر تلک، سی آر داس، لاجپت رائے، جتندر ناتھ داس، موتی لال نہرو، بھگت سنگھ، گاندھی، تیج بہادر سپرو، سروجنی نائیڈو، رفیع احمد قدوائی اور ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ محروم کو لالہ لاجپت رائے سے خصوصی لگاؤ معلوم ہوتا ہے لیکن ناموں کی اس فہرست ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی عقیدت مذہبی یا علاقائی حدود کی پابند نہیں تھی۔ وہ وطنیت اور قومیت کے لیے ایثار کرنے والوں کے پرستار تھے، وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔

محروم چاہتے تھے کہ پوری ہندستانی قوم مذہبی، تہذیبی اور لسانی اختلافات کو نظرانداز کرکے حصولِ آزادی کی تحریک میں شریک ہو اور باہمی محبت اور اخلاص کو اپنا شعار بنالے۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کی آرزو اور توقع کے خلاف ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے تھے۔ یہ ہماری قومی زندگی کا بڑا افسوسناک پہلو رہا ہے۔ اس معاملہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قومی قیادت دقّتِ نظر اور بصیرت سے زیادہ جذبات سے کام لینے کی کوشش کرتی رہی ہے، جس سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوسکے اور معاملات برابر الجھتے گئے۔ بہر کیف جس بات کی توقع بڑے بڑے قومی رہنماؤں سے نہیں کی جاسکتی، محروم سے کرنا تو نادانی ہوگی لیکن اتنا وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان فسادات سے بہت دل برداشتہ تھے۔ فساد کرنے والوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، قوم کے دشمنوں میں شمار کرتے تھے۔ ان کی متعدد نظموں میں ایسے واقعات پر انتہائی رنج و غم اور کبھی کبھی ان سے بیزاری کا اظہار ملتا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۴ء میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔ اس وقت کی ایک نظم میں کہتے ہیں:

قید سے ہوں گے رہا جب سرفروشانِ وطن — یوں کہیں گے دیکھ کر حالِ پریشانِ وطن
حیف ہم جن کے لیے محرومِ آزادی ہوئے — اپنے ہاتھوں سے وہ جاہل وقفِ بربادی ہوئے

محفلِ حبِ وطن میں کل جو تھے شیر و شکر　　آج ہیں اک دوسرے کے تشنۂ خوں سر بسر

محروم کو پہلے اس بات پر فخر تھا کہ کم از کم پنجاب کی فضا اس فتنے سے محفوظ ہے لیکن مارچ ۱۹۴۷ء میں جب وہاں بھی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی، تو انھیں کہنا پڑا۔ (لہجہ کی درشتی ملاحظہ فرمایئے):

آدمیت کے لباسِ برتری کو پھاڑ کر　　شوقِ عریانی میں یہ رقصِ جنوں، اے فتنہ گر!

تو نے اپنی بربریت کے دکھائے وہ ہنر　　خاک میں جن سے ملی توقیرِ انساں سر بسر

آسمانوں سے صدا آئے گی یہ شام و سحر

حیف، اے پنجاب! تجھ پر اور تری تہذیب پر!

آج تک دیکھی سنی ہے کس نے ایسی سرزمیں　　بے گناہوں، امن خواہوں کو اماں جس میں نہیں

چیر ڈالیں شیر خواروں کے جگر ابابِ کیں　　بھون ڈالے جائیں یوں اپنے مکانوں میں مکیں

اس شقاوت کو شجاعت نام دیں از راہ شر

حیف، اے پنجاب! تجھ پر اور تری تہذیب پر

زندگی کی حرکت اپنے اصولوں کی پابند ہے۔ زندگی ہماری نیک خواہشات کے اشاروں پر نہیں چلتی۔ اوپر کے بند ہی اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیئے کافی ہیں۔ چونکہ محروم اور ان کے خاندان کو بھی ۱۹۴۷ء میں دہلی آکر بسنا پڑا تھا جہاں کی فضا شروع شروع میں انھیں غیر مانوس محسوس ہوتی تھی، اس لیے اس قیامتِ صغریٰ کے بیان میں ان کے ذاتی اضطراب کا خلوص بھی شامل ہے۔ تقسیم کے وقت اور اس کے بعد محروم اور ان کے عزیزوں پر جو بیتی، فسادات نے ان کے ذہن کو جس طرح جھنجھوڑا، وہ شکستِ خواب کی ایک اور قابلِ توجہ مثال ہے۔ یہ آپ بیتی ہے۔ لیکن یہ جگ بیتی بھی ہے کیوں کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہوا، دونوں ملکوں کے لاکھوں آدمیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ اس سے متعلق ان کے جذبات کا اندازہ لگانے کے لیے ان کی نظم "پاکستان کو الوداع" کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

اے مرے پیارے وطن، میرے بزرگوں کے وطن!　　اے مری راحت کی دنیا! اے مرے اچھے وطن!

عمر بھر تیری وفاداری کا دم بھرتا رہا
مدح تیری شعر میں زیبِ رقم کرتا رہا

مشغلہ میرا رہا علم و ادب، شعر و سخن
اور سمجھا میں اسی کو خدمتِ اہلِ وطن

حرصِ دنیا سے رہا یک سُو دلِ دانش پذیر
ننگِ فن میرے لیے تھا ذوقِ دیبا و حریر

تو نے لیکن اے وطن! مجھ کو دیا انعام خوب
زندگی کے دورِ آخر میں ہوا انجام خوب!

اس کے بعد فسادات کی تباہی اور غارت گری کا ذکر کر کے کہتے ہیں:

محشر آرائی سے تیری جو ستم کش بچ گئے
بے سر و ساماں وہ نکلے ڈھونڈنے گھر کونے

ان میں شامل ہے مرا نورِ نظر آزاد بھی
تجھ سے کوسوں دور، دلّی میں اماں جس کو ملی

اس کے نغمے بھی ہوئے تیری فضاؤں پر گراں
کس لیے تو ہو گیا اس درجہ ہم سے سرگراں؟

ہم نے یہ مانا ترے اپنے سخنور کم نہیں
اپنے جانے سے تری بزمِ سخن برہم نہیں

ہم بھی تیرے ہی نوا سنجِ چمن تھے اے وطن!
عندلیبِ نغمۂ حُبِّ وطن تھے اے وطن!

اتحادِ ہندو و مسلم کے ہم خواہاں رہے
تیری بے انصافیوں پر بھی وفا پیماں رہے

تیری آزادی کے صدقے میں ہمیں ہجرت ملی
جذبۂ ذوقِ وفا کی ہم کو یہ قیمت ملی

یہ اقتباس کسی قدر طویل ہو گیا ہے لیکن محرومؔ کے جذبات کا اندازہ کرانے کے لیے اسے پیش کرنا ضروری تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وقت زخموں پر مرہم رکھتا گیا، زخم مندمل ہوتے گئے۔ محرومؔ نے اپنے "نئے وطن" کی خوبیوں کے راگ گانے شروع کر دیے۔ حیرت یہ ہے کہ تقسیم سے بعد کی ان نظموں میں قومی حالات کی مسلّمہ ابتری کی ہلکی سی بھی تنقید نہیں ملتی، جس کی ہر دور کا سماج اپنے شاعر سے امید رکھتا ہے۔

محرومؔ نے مظاہرِ قدرت پر بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ ان چیزوں کا ذکر اردو شاعری میں پہلے بھی آتا تھا لیکن وہ اٹھارھویں صدی کی انگریزی شاعری کی طرح بہت کچھ روایتی اور کتابی ہوتا تھا، شاعروں کے ذاتی مشاہدے اور تجربہ کا نتیجہ نہیں تھا۔ لہٰذا جب ہم اس طرح کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان باتوں کے بیان کرنے میں شاعر

کے دلی لگاؤ کو بھی کچھ دخل ہے، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے جذبات یا خیالات کے اظہار کے لیے ان چیزوں کے رسمی تصورات سے استفادہ کر رہا ہے۔ اس بات کو شاعری میں تحریکِ اصلاح کے پیش رووں نے بھی محسوس کیا، جس کا نتیجہ حالی کی "برکھارت" ایسی نظمیں ہیں۔ اس طرح یہ خیال تو تسلیم کیا جانے لگا کہ قدرت کی منظر نگاری واقعیت پر مبنی ہونی چاہیے۔ شاعر کو ذاتی تجربات کی بنا پر مناظرِ قدرت سے متعلق نظمیں لکھنا چاہیے، لیکن جس طرح اٹھارہویں صدی کے بعد انگلستان میں رومانی تجدید کے شاعروں مثلاً ورڈزورتھ، شیلے، کیٹس کو مظاہرِ قدرت میں انہماک تھا۔ یہ مناظر ان کے دلوں کے تاروں میں جس طرح لرزش اور آہنگ پیدا کرتے تھے، وہ ان اصلاح پسند شاعروں کے یہاں نہیں ملتا۔ ویسے ان انگریزی شاعروں کی ایسی نظمیں بھی ان کے پیشِ نظر نہیں تھیں۔ پھر فنی صلاحیت کی بات بھی ہے۔ جہاں تک محروم کا تعلق ہے انھوں نے انگریزی پڑھی تھی۔ انگریزی شاعری کا بھی کچھ علم انھیں تھا۔ اس ضمن میں ورڈزورتھ کے تتبع کی کوشش بھی غالباً انھوں نے کی، لیکن ایک تو انگریزی شاعری کا ان کا مطالعہ بہت وسیع نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے اگر ایسا ہوتا بھی تب بھی اُن رومانی شاعروں کی جذباتی لطافتوں اور نزاکتوں اور تخیل کی بلندیوں تک پہنچنا ان کے لیے دشوار تھا۔ اردو شاعروں کا تو ذکر ہی کیا خود انگریزی شاعری وکٹورین عہد میں ان خصوصیات اور معیار کو برقرار نہ رکھ سکی۔

اس کے باوجود محروم کی اس نوع کی نظموں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ان میں سے اکثر میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس سے شاعر کے کمالِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ بہر حال یہ بات تو ہے ہی کہ محروم کی مظاہرِ قدرت سے متعلق نظمیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں جو اصلاحی دور کے شاعروں نے اپنے لیے قائم کیا تھا۔ یہ نظمیں ایسے عناصر سے قطعی پاک ہیں جنھیں واقعیت کے خلاف سمجھا جا سکے۔ پھر ان میں سے کئی میں شاعر کے ذاتی مشاہدہ کی تازگی بھی موجود ہے۔ اسلوبِ بیان میں خلوص کی حدت بھی ہے اور تاثیر بھی۔ مطالعہ کی سہولت کے لیے

ان نظموں کو کئی حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

محروم کی کچھ نظمیں تو ایسی ہیں جن میں شاعر کی توجہ فطرت کے مناظر و مظاہر کے حسن پر مرکوز رہی ہے۔ ان سے حاصل ہونے والے کیف و سرور کو لطیف استعاروں اور تخیل کی نکتہ آفرینیوں میں رنگ کر پیش کیا گیا ہے۔ ان نظموں کی اہمیت زیادہ تر جمالیاتی ہے اگرچہ کہیں کہیں مظاہرِ قدرت کی افادی خصوصیات بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ان میں بہار اور بسنت پر کئی نظمیں، "وقتِ سحر"، "ماہِ تاباں"، "آفتاب"، "دھوپ"، "کوہ مری" اور "خفتگانِ خاک سے" شامل ہیں۔ اس کا اندازہ ان دو تین شعروں سے ہو سکتا ہے جو نظم دھوپ سے نقل کیے جاتے ہیں:

پاکیزہ مثلِ دامنِ پاکاں یہ دھوپ ہے، حسنِ عمل کی طرح درخشاں یہ دھوپ ہے،

تصویرِ حسن، آب گہر سے دھلی ہوئی یا ہے کوئی حسین حقیقت کھلی ہوئی

سرمایۂ نشاط ہے یہ دلپذیر دھوپ قوت فزائے دل ہے کہ ہے جوئے شیر دھوپ

دوسری قسم کی نظمیں وہ ہیں جن میں شاعر کا مقصد منظر نگاری کے سہارے کسی فلسفیانہ یا اخلاقی تصور کا اظہار رہتا ہے۔ ادب میں خیال جذبہ پر غالب آجاتا ہے اور مظاہرِ قدرت کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں تو شاعر "ماہتاب" ایسی نظموں میں بھی جن کی فضا حسن و جمال کے قمقموں سے جگمگاتی دکھائی دیتی ہے کبھی کبھی انسانی زندگی پر چھائی ہوئی غم کی تاریکی کا ذکر کر گزرتا ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے کچھ نظمیں لکھی ہی اس لیے گئی ہیں کہ ان میں یہ بتایا جائے کہ زندگی انسانی روح پر ایک بارِ گراں ہے، زندگی حباب و سراب ہے؛ فنا ہر شے کا مقدر ہے، جن چیزوں کا آغاز شاندار اور مسرت آگیں ہے ان کا انجام عبرتناک ہے۔ ایک نظم ہے "انجام گل" جس کا مرکزی خیال ہی یہ ہے: "آغاز ہے دلنواز سب کا، انجام ہے جانگداز سب کا"۔ ایسی ہی ایک اور نظم "سبزۂ نو" ہے۔ یہی خیال اس میں بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں:

گلہائے لطفِ دنیا ہر چند چیدنی ہیں نظارہ ہائے عالم دلکش ہیں، دیدنی ہیں

لیکن غضب تو یہ ہے ان میں بقا نہیں ہے افسوس دل لگی کا کچھ بھی مزا نہیں ہے

اب ایک ایسی نظم لیجیے جس میں شاعر کا مقصد تلقین کرنا رہا ہے۔ یہ خوبی اسے بوے گل میں نظر آتی ہے۔ اس لیے اسے اس طرح مخاطب کیا گیا ہے:

ریاضِ دہر خود ہو کے انتشار نصیب — مشامِ خلق کو تو نے کیا بہار نصیب
اُجڑ کے خود جو ہوا کو بسا دیا تو نے — سبق زمانے کو ایثار کا دیا تو نے

ظاہر ہے کہ ان نظموں کا موضوع سنجیدہ ہے جسے مظاہرِ قدرت کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اب بھی یقیناً ایسے ہیں جنھیں یہ تصورات اہم معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ نظمیں بھی انھیں قابلِ قدر محسوس ہوں گی لیکن دوسرے لوگوں کا ان سے زیادہ لطف اندوز ہونا مشکل ہے۔

مجھے ان سے زیادہ دلکش وہ نظمیں محسوس ہوتی ہیں جن میں شاعر کی طبیعت میں جاگزیں غم مظاہرِ قدرت میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔ اس طرح یہ داخلی اور خارجی افسردگی ہم رنگ و ہم آہنگ ہو کر ایسی نظموں کی فضا کو غم آلود بنا دیتی ہے۔ محروم کی زندگی میں کچھ غیر معمولی سانحات پیش آئے جس سے ان کی طبیعت میں رنج و ملال رس بس گیا۔ وہ کلیتہً قنوطیت پسند تو نہیں بن گئے لیکن ان کے مزاج پر سوز و گداز کا عنصر غالب آگیا اور ان کی نظر اداسی میں ایک طرح کا سکونِ خاطر محسوس کرنے لگی۔ اس کی جھلک ان کی نظموں "اترا ہوا دریا" اور "وادیِ غم" میں نظر آتی ہے۔

اترے ہوئے دریا کو دیکھ کر شاعر کو وہ زمانہ یاد آجاتا ہے جب یہ دریا چڑھا ہوا تھا، اس کی لہریں بلند ہو ہو کر جوش و خروش میں درختوں کو اکھاڑتی پچھاڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں؛ لیکن اب وہی دریا ہے کہ اتر کر جوئے کم آب بن گیا ہے۔ اس کے کنارے قبرستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ جس پر کچھ عجیب قسم کی اداسی برس رہی ہے۔ شاعر کے لفظوں میں "ہو گئے دونوں کنارے پسلیاں بیمار کی"۔ اس المیے کو اور شدید بنانے والا خیال یہ ہے کہ وقت آنے پر یہ دریا ایک دن پھر اپنی کھوئی ہوئی قوت حاصل کرے گا؛ اس کی جوانی قدرت نے بطور امانت اپنے پاس رکھی ہوئی ہے جو کسی وقت اس کے حوالے کر دی جائیگی۔

لیکن واپس نہیں ملیگی تو انسان کی گزری ہوئی جوانی! اسی لیے شاعر بیتابی سے پوچھتا ہے:

اے فلک! اے چاند تارو! اے فضاؤ! اے زمیں!   کیا شباب رفتہ اپنا بھی امانت ہے کہیں؟

ایسی ہی ایک نظم "وادیِ غم" ہے، جہاں ہر وقت ماتم چھایا رہتا ہے۔ اس سے شاعر کی پژمردہ طبیعت ہم آہنگ ہے۔ شاعر اکثر اس کی سیر کو جایا کرتا ہے کیونکہ اِس سے اُس کی طبیعت کو سکون ملتا ہے:

اک سکوتِ دائمی ہر شے پہ ہے چھایا ہوا   وقتِ پیدائش سے ہے ہر پھول مرجھایا ہوا

سیر اس وادی کی اکثر آ کے کر جاتا ہوں میں   میری نظروں میں یہ رہتی ہے، جہاں جاتا ہوں میں

"گنجِ معانی" میں محرومؔ کی چار نظمیں ہیں: "بلبل کی فریاد"، "چڑیا کی زاری"، "مچھلی کی بیتابی" اور "کولھو کا بیل"۔ ذکر ان کا پہلے بھی آ چکا ہے۔ ان نظموں میں بھی بڑا سوز و اضطراب ہے، خصوصاً پہلی دو میں؛ لیکن ان کی نوعیت مختلف ہے۔ ان سب میں کمزور، معصوم اور بے زبان جانوروں کے ساتھ انسان کے ظلم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یوں تو جانوروں پر رحم کا جذبہ کسی کے بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہے لیکن یہاں یہ جذبہ محرومؔ کی مخصوص "ہندویت" پر دلالت کرتا نظر آتا ہے۔ یہ چاروں نظمیں مظلوموں کی فریادوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں شاید سب سے زیادہ جاذبِ توجہ "چڑیا کی زاری" ہے۔ کسی لڑکے نے جسے شاعر "بدنہاد اور نابکار" قرار دیتا ہے، شرارتاً بیچاری چڑیا کا گھونسلا توڑ ڈالا اور اس کے بچوں کو مار ڈالا؛ اسی پر وہ نالہ کناں ہے۔ نظم کی عام فضا، چڑیا کے الفاظ، اُس کے جذبات، اُس کا لہجہ سب مل کر ہمیں حالیؔ کی "مناجاتِ بیوہ" کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں۔ منظر بڑا رقت خیز ہے۔ اپنے بچوں کو دیکھ کر چڑیا کہتی ہے:

مٹی پہ واے قسمت بیجان پڑے ہوے ہیں   کس نیند میں یہ میرے ناداں پڑے ہوے ہیں

افسوس، نسلِ انساں تجھ میں وفا نہیں ہے!   کہتے ہیں اُنس جس کو تجھ میں ذرا نہیں ہے!

غدّار! بے وفائی تیری سرشت میں ہے   تیرا ہی دیرہ دنیاے زشت میں ہے

اسی طرح بلبل قفس میں بے تاب ہے، پھر سے باغ کی کشادہ فضائیں اڑتے پھرنے اور خوشی سے

چھپانے کی حسرت اُس کے سینے میں آگ لگا رہی ہے۔ مچھلی پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دی گئی ہے جہاں وہ پڑی برابر تڑپ رہی ہے۔ کولھو کا بیل اپنی آزادی کھو کر تیلی کی غلامی پر مجبور ہے۔ وہ لگاتار گھومتے رہنے سے عاجز آ چکا ہے۔ اس زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے موت کی دعا مانگتا ہے۔

اب میں مظاہرِ قدرت پر کچھ ایسی نظموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو محروم کے انفرادی تجربات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لیے ان میں خلوص کا عنصر اور بھی زیادہ ہے۔ یہ نظمیں ہیں "سندھ کو پیغام" اور "دریائے سندھ کی یاد" ـــــ پہلی ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی تھی، جب انھیں سندھ سے جدا ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ دوسری اس سے اکتالیس سال بعد ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی جب محروم جمنا کے کنارے آ کر آباد ہو چکے تھے۔ ذکر آ چکا ہے کہ ان کا لڑکپن ایک ایسے مقام پر گزرا تھا جو دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ انھیں سندھ کے ساحل سے خاص شغف تھا جہاں وہ سیر کو جاتے اور دریا کی فضا سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ قصبے کے غیر شاعرانہ ماحول سے نکل کر فکرِ شعر کے لیے بھی یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ بہر کیف یہ نظمیں شاعر کے بچپن اور جوانی کی دلکش یادوں پر مبنی ہیں۔ ان یادوں کے ساتھ اُن کے بیتے ہوئے ایام کی کہانیاں گندھی ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں گردشِ ایام کو لوٹانے کی بے پناہ آرزو بھی ہے۔ سندھ کا ساحل چھوڑے ساٹھ برس بیت گئے ہیں، محروم دہلی آ چکے ہیں، لیکن سندھ کی یاد بدستور دامن گیر ہے۔ حسرت بھرے لہجے میں کہتے ہیں:

اے سندھ! تری یاد میں جمنا کے کنارے
آنکھوں سے اُبل آئے ہیں احساس کے دھارے

پھر کہتے ہیں:

بھولا نہیں عالم تری امواجِ رواں کا
وہ ماضیِ رقصاں مری عمرِ گزراں کا
تو اور تلاطم وہ مرے ذوقِ نہاں کا
افسوس کہاں میں ہوں، یہ قصہ ہے کہاں کا
گو رشتہ کناروں سے ترے توڑ کے آیا
طفلی بھی جوانی بھی، وہیں چھوڑ کے آیا

افکارِ محرومؔ

جن نظموں میں شاعر کی اپنی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، اُن میں وہ نظمیں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں جنھیں "گنجِ معانی" کے ایک باب میں "طوفانِ غم" کے عنوان سے جمع کر دیا گیا ہے۔ سر عبدالقادر نے بھی اس کتاب کے دیباچے میں ان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ محرومؔ کی بیوی عین جوانی میں ایک چھوٹی سی بچّی کو چھوڑ کر چل بسی تھیں۔ اس سانحے سے اُن کے دل پر جو گزری اُس کا اظہار ان نظموں میں کیا گیا ہے۔ آپ بیتی ہونے کی وجہ سے ان میں غم کا بڑا گہرا احساس ملتا ہے۔ ان میں سوز و گداز کی چنگاریاں اور شدید چوٹ کھائے ہوئے دل کی ٹیسیں موجود ہیں۔ چھوٹی سی بچی "وِدّیا" کی طفلانہ معصومیت اور نادانی کے پس منظر میں یہ حادثہ اور بھی جانکاہ بن جاتا ہے۔ ان میں "دردناک منظر" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس کا یہ مقام دیکھیے، جہاں نادان بچّی ماں کی میّت کے پاس پہنچتی ہے، اس امید میں کہ ماں حسبِ سابق اُسے پیار کرے گی اور دودھ پلائے گی:

گھٹنوں پہ چل کے نکلی، بستر کے پاس پہنچی نھّے سے آہ، دل میں کچھ لے کے آس پہنچی
کیا مطمئن، سنبھالے ہوش و حواس پہنچی لیکن کچھ اس سے پہلے اے وائے یاس پہنچی!

کس کو پکارتی ہے منہ سے کفن اٹھا کر
منزل پہ ٹھنڈے ٹھنڈے پہنچی وہ لدلدا کر

ان سرد چھاتیوں میں کیا شیر ڈھونڈتی ہے! پتھر میں موم کی تو تاثیر ڈھونڈتی ہے!
اب شمعِ کشتہ میں کیا تنویر ڈھونڈتی ہے! کیسے شکار ہائے، تقدیر ڈھونڈتی ہے!

مُردے سے اپنی ماں کے یہ پیار کر رہی ہے
مجھ سخت جاں پہ یارب! یہ کیا گزر رہی ہے؟

ان کے علاوہ محرومؔ کی کچھ اور نظمیں ہیں، جو ان کی زندگی کے واقعات اور ان پر ان کے تاثرات کو نمایاں کرتی ہیں۔ "کنارِ راوی" سے ان کے والدِ محترم کے انتقال اور ان کے ذہن پر اس کے اثر کا پتہ چلتا ہے۔ "باپ کے آنسو" میں اسی وِدّیا کی شادی کا ذکر ہے، جو ماں کی وفات کے

وقت چھوٹی سی بچی تھی۔ پھر ایک اور نظم ہے "وِدّیا کی خودکشی پر" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار بچے ہونے کے بعد وِدّیا نے سسرال میں کسی رنجش کے باعث خود کو آگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اس سے محرومؔ کے دل پر کیا گزری، اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس نظم کا پڑھنا ضروری ہے۔ ایک اور نظم "کم سن بچی کے مدفن پر" ہے، جس میں شاعر کی شیر خوار بیٹی شکنتلا کی موت کا ذکر ہے۔ بیٹی سے کہتے ہیں:

خوش ہو کے پھر اچھل کہ جگن میرے ساتھ ہے　　آنکھوں سے اس کے اشک ہیں جاری، شکنتلا!
باپ اور بھائی دونوں تجھے لینے آئے ہیں　　با آہ واشک وگریہ وزاری، شکنتلا!

ان نظموں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ محرومؔ کے مزاج میں جوشِ اصلاح، حبِ وطن اور ذوقِ حرکت وعمل کے باوصف ایک طرح کی افسردگی، دنیا سے بے تعلقی، سوز وگداز اور کبھی کبھی جھنجھلاہٹ کے جوزیریں دھارے بہتے نظر آتے ہیں ان کے منبعے محض اردو شاعری کی روایتی الم پرستی، قنوطیت اور کچھ فلسفیانہ تصورات ہی میں نہیں ہیں، بلکہ ان کی اپنی زندگی کے حادثات میں بھی ہیں جو ان کی شاعری کی فضا کو غم آلود بنانے میں شریکِ غالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر محرومؔ نے بچوں کے لیے بہت نظمیں کہی ہیں جن میں سے کچھ "بہارِ طفلی" کے نام سے ایک مجموعے میں جمع کر دی گئی ہیں۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ گذشتہ صدی کے اواخر اور موجودہ کے ربعِ اول میں عام اصلاح کی تحریک کی جو صورت تھی، اُس میں تعلیم وتدریس کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ چنانچہ نئی قسم کے اسکولوں کے نصاب کا سوال بھی پیدا ہوا۔ شمالی ہندوستان میں اردو کا بہت رواج تھا اور اسی مقبولیت کے سبب اردو میں بچوں کے ادب کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس مقصد کے پیشِ نظر جو ادب تخلیق کیا گیا اس میں جہاں بچوں کی مخصوص دلچسپی، سلاستِ زبان وبیان وغیرہ کا خیال رکھا گیا، وہیں یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ بچوں کی خاص ضرورتوں مثلاً ان کی دینی، اخلاقی اور شہری تربیت کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس وقت جن لوگوں نے بچوں کے لیے لکھا، وہ مدارجِ عمر کے اعتبار

سنے بچوں کے ذہنی ارتقار، اور نفسیاتی تنوع سے بخوبی واقف تھے اور ہر درجۂ عمر کے بچوں کے لیے الگ الگ طرح کا ادب تخلیق کرنے پر قادر تھے لیکن اتنا صحیح ہے کہ بچوں کی عام ضروریات کا احساس انھیں تھا۔ جن شاعروں نے اس غرض سے یا بچوں کو بہتر انسان بنانے کی نیت سے اچھی نظمیں لکھیں، ان میں حالی، اسمٰعیل، اقبال اور افسر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انھی میں محروم کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ بچوں کے لیے جو نظمیں انھوں نے کہیں، ان میں کچھ تو طبع زاد ہیں اور کچھ مقبول انگریزی شاعروں کے تراجم۔ یہ نظمیں اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے کئی طرح کی ہیں۔ مثلاً کچھ ایسی ہیں کہ ان میں بچوں سے مشفقانہ خطاب کر کے انھیں نصیحتیں کی گئی ہیں۔ کچھ میں خود بچے اپنے ولولوں کا اظہار کرتے ہیں، ایک نظم "جیسی کرنی ویسی بھرنی" کہانی کے پیرایے میں ہے جس میں اسکول کی بچیوں کو بوڑھوں اور اپاہجوں کی مدد کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ ان سب نظموں کے پڑھنے سے شاعر کی بچوں میں گہری دلچسپی اور ان سے مخلصانہ محبت کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر کے دل میں انھیں ہنسی خوشی آپس میں پیار محبت سے رہتے اور کھیلتے کھاتے دیکھنے کی تمنا موجزن ہے۔ وہ ان میں نیکی، سچائی، ذوقِ علم، صحت و صفائی، محنت، وطن دوستی اور خود اعتمادی ایسی صلاحیتوں کو فروغ دینے کا متمنی ہے اور انھیں سستی، بدزبانی، خود غرضی، حسد، نخوت وغیرہ اخلاقی ذمائم سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کے لیے یہ نظمیں بھی شاعر کے عام اصلاحی مقاصد ہی کا ایک حصّہ ہیں اور روحِ عصر سے مطابقت رکھتی ہیں۔

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو پروفیسر محروم کا اردو شاعری کے ارتقا میں ایک اہم مقام ہے۔ ان کی نظمیں گوناگوں محاسن کی حامل ہیں جس کا اعتراف نہ کرنا غلط بھی ہوگا اور احسان ناشناسی بھی۔

●●

محروم کی غزل

از

محمد حسن

ایم اے، پی ایچ ڈی

دلی یونیورسٹی، دلی

محمد حسن

محروم کی غزل

غزل بتِ عشوہ طراز ہے، جس کے ہر شیوے کے مختلف نام ہیں۔ اس کی علامتوں کے پیچھے ایک جہانِ معنی آباد ہوتا ہے؛ انہی علامتوں میں دل کی داستان بھی کہی جا سکتی ہے اور حیات و کائنات کے رموز و معارف بھی ادا ہو سکتے ہیں۔ یہاں واقعہ نہیں، تاثر نظم ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے "انتہاؤں کا سلسلہ" کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آرٹ جس قدر نازک ہوگا، اسی قدر ریاضت کا وہ فن کار سے متقاضی بھی ہوگا۔ غزل گو بہت ہیں؛ لیکن اچھے اور کامیاب کم اور عظیم غزل گو تو صرف چند ہوئے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غزل جلد حاوی ہو جاتی ہے، لیکن غزل پر صرف چند شاعر ہی حاوی ہو پائے ہیں۔ غزل جو چاہتی ہے، کہلوا لیتی ہے۔ لیکن اس کا اعجاز صرف چند کو حاصل ہے کہ وہ غزل سے جو چاہیں، کہلوا سکیں۔ اس فہرست میں شاید غالب اور اقبال کے علاوہ شاید ہی کوئی اور نام لیا جا سکے۔

غزل اپنے قافیے کی جھنکار اور اپنی علامتوں کی دلکشی کے سہارے جو چاہے، کہلوا لیتی ہے۔ شاعر صوفی نہ ہو، مگر قافیہ کا ذہنی تلازمہ اسے تصوف کے راستے پر لے جاتا ہے؛ مرید جام نہ ہو، مگر غزل کی مستی اسے رند بنا دیتی ہے اور میخانہ میخانہ بھٹکاتی ہے؛ عاشق مزاج نہ ہو، مگر غزل کا کیف و آہنگ اُسے زلف و لب و رخسار کا سودائی بناتا ہے یا کم سے کم اسے بہت سے ناکردہ گناہوں کا دعویدار بنا ڈالتا ہے۔ لیکن قوافی کی جھنکار اور بعض مضامین کی مقبولیت کے علاوہ غزل کا ایک بہت بڑا جوہر یہ ہے کہ وہ ہمارا تہذیبی ذریعۂ اظہار ہے۔ اس کے پیچھے

ہندوستان کی کئی سو سالہ تاریخ ہے، جس نے ہندوستانی اور ایرانی شائستگی کے نچوڑ سے بعض نفاستیں اور لطافتیں پیدا کی تھیں، اِن نفاستوں میں ایک کیفیت اور اہمیت لب ولہجہ اور اندازِ گفتگو کی بھی تھی، جسے داغ نے غزل کا طرۂ امتیاز بنایا تھا۔ لیکن اس سے قطع نظر غزل زبان کو خراد پر چڑھانے اور الفاظ اور تراکیب کے مختلف رُخ، زاویے، پہلو اور انداز ظاہر کرنے کے بھی کام آئی۔ ایسے اساتذہ کی تعداد کافی ہے جن کے دیوان میں مزیدار شعر کم ہیں، لیکن انھوں نے لفظ کو برتنے کی تمیز سکھائی ہے، اور اس کے مفہوم اور تلازمے کی حدیں متعین کی ہیں یا ان میں توسیع کی ہے۔

بالعموم جن مضامین سے غزل میں رعنائی آتی ہے، اُن سے محروم صاحب نے کچھ زیادہ اعتنا نہیں کیا۔ عشق و عاشقی کے جذبات کا اظہار ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ اسی لیے انھوں نے اپنی رومانی نظموں کو بھی اعتذار کے ساتھ شائع کیا ہے۔ شراب نوشی کی مخالفت میں ان کی کئی نظمیں موجود ہیں؛ رندِ شاہد باز اور عاشقِ رسوا کے کوچے جداگانہ ہیں؛ محروم صاحب کی روش کچھ اور تھی۔ وہ سلامت روی کے قائل اور اعتدال کے رسیا، غزل کی بے سر جوش دیوانگی کی متقاضی۔ اسی لیے ان دونوں کے کوچے الگ الگ ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ محروم کی غزلوں میں اُن کی نظموں کی سی کیفیت موجود نہیں ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ محروم غزل کے تہذیبی شعور سے بیگانہ تھے۔

یہ بات بظاہر چھوٹی سی ہے، مگر اس لحاظ سے اہم ہے کہ غزل کا کوئی کتنا ہی بڑا مخالف کیوں نہ ہو، لیکن اگر وہ غزل کے کسی نشتر کو سُن کر بے اختیار ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو اُس نے یقیناً ہمارے تہذیبی ذوق سے اپنا رشتہ استوار نہیں کیا ہے۔ غزل کے رموز و علائم کو پہچاننے اور اُن سے مزا لینے کے لیے ضروری ہے کہ اسے معلوم ہو کہ ان علامتوں کی تشکیل کن منزلوں سے گزری ہے مثلاً جب غزل کا شاعر شراب کا ذکر کرتا ہے، تو اس کی مراد صرف شراب سے نہیں ہوتی؛ جب وہ شیخ و برہمن کا مذاق اڑاتا ہے، تو مراد صرف تضحیک یا تمسخر نہیں

ہوتا بلکہ تنگ نظری، کٹرپن اور ہر قسم کے تعصب کا مذاق اڑانا مقصود ہوتا ہے۔ اسی لیے غزل کے لطیف اشارے صرف اسی شخص کے لیے بامعنی اور پُرکیف ہیں، جو ان تہذیبی علامتوں کا زبان داں بلکہ مزاج داں ہو۔ ممکن ہے، کسی کے نزدیک محروم بڑے غزل گو نہ ہوں لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ غزل کے مزاج داں ضرور ہیں؛ اس کا ثبوت ان کی غزلوں سے ملتا ہے۔

غزل کا مزاج داں ہونے کے لیے ضروری ہے کہ شاعر غزل کے مختلف ادوار کے رنگ و آہنگ سے باخبر ہو، اور اسی کے ساتھ غزل کی زبان، اس کے لب و لہجے، اس کے آہنگ کو کم سے کم کاریگری کے ساتھ استعمال کر سکے۔ محروم نے الفاظ کو اسی چابک دستی اور ہنرمندی سے جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔ لکھنؤ کے اساتذہ نے ان الفاظ کی تربیت کی تھی؛ ہر لفظ کا ایک خاندان، ایک تلازمہ اور ایک لازمی ربط قرار دے لیا تھا۔ ان کے ہاں مصرعے اعلیٰ مرصع سازی کے نمونے ہیں، جو نگوں کی طرح ساتھ ساتھ جڑے ہیں؛ اور اس طرح جڑے ہیں کہ ایک کی جگہ دوسرا نہیں جڑا جا سکتا۔ اس طریقۂ کار میں ذریعۂ اظہار کی آزادی کم ہوئی، لیکن الفاظ "گنجینۂ معنی کا طلسم" ضرور بن گئے۔ کیفیت کم ہوئی، مگر لفظوں کو اپنی بازیگری دکھانے کا موقعہ ہاتھ آ گیا۔

محروم کی غزلوں میں یہ دونوں انداز ملتے ہیں۔ محروم نے جب غزل گوئی شروع کی، اس وقت اردو غزل کے بازار میں داغ کا سکہ چلتا تھا۔ ان کی صفائی، سادگی اور بے ساختگی، مزیداری، رندانہ چھیڑ چھاڑ کا انداز، اور گفتگو کا لب و لہجہ، مشاعروں کی چھتیں اڑائے دیتا تھا۔ داغ نہ صوفی تھے، نہ واعظ؛ سیدھی سادی پیار محبت کی باتیں، سیدھے سادے چبھتے ہوئے لفظوں میں مزے کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اس روایت کو ان کے بعد کوئی پروان نہ چڑھا سکا، بلکہ صحیح طور پر جاری بھی نہ رکھ سکا۔ مگر ان کے اثرات بہت دور تک پہنچے، اور یہ اُس دور کے اکثر غزل گو شعرا کے کلام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ محروم بھی ان سے نہیں بچے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ترکِ عشقِ بُت خود کام غلط ہم پہ دانستہ یہ الزام غلط

ستم کوئی نیا ایجاد کرنا ۔۔۔ تو مجھ کو بھی مری جاں، یاد کرنا

چلو اب لطف ہی کو آزماؤ ۔۔۔ تمھیں آتا نہیں بیداد کرنا

بُتِ بے وفا! تجھ کو معلوم بھی ہے ۔۔۔ کہ ہونا ہے پیشِ خدا ہر کسی کو

صبا! قیس کی بات کا بھی جواب ۔۔۔ کدھر نکہتِ زُلفِ لیلیٰ گئی؟

قسم خدا کی، زمانہ یقین کر لیتا ۔۔۔ اگر خدائی کا دعویٰ یہ خوب رُو کرتے!

آپ کو مجھ سے کدورت نہیں، کیا فرمایا ۔۔۔ صدقے اس صاف بیانی کے، بجا فرمایا

اس صاف بیانی کے نمونے ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔ ایک جگہ اسے طرزِ صاف گوئی سے تعبیر کیا ہے اور اسے پسندِ خاطر قرار دیا ہے:

پسندِ خاطرِ محرومؔ صاف گوئی ہے
چھپا سکتا ہوں ورنہ دل کا مطلب استعاروں میں

رعایتِ لفظی اور لکھنوی رنگِ شاعری کے نمونے بھی محرومؔ کے کلام میں موجود ہیں۔ یہ صاف گوئی اُن کے عجزِ بیان کی دلیل نہیں، پسندیدگی کا مشغلہ ہے۔ اسی لیے جب وہ غزل کے کوچے میں لکھنوی انداز سے نکلتے ہیں، تو بانکپن اور طرحداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آج اس طرز کا چلن نہیں ہے، اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اس سے کیفیتِ شعری کے مجروح ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ لیکن شاگردانِ ناسخ و آتش و مصحفی اور پھر ان شاگردوں کے شاگردوں کے کلام میں یہ رنگ ثقالت اور خشکی سے کچھ پاک و صاف ہو کر نکھر آیا تھا۔ محرومؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

بے یار رات بھر رہے بیخواب ابر میں
تہ کر کے رکھ دی چادرِ مہتاب ابر میں

لکھنوی رنگِ سخن کی یاد دلانے والے بعض اور شعر بھی محروم کی غزلوں میں بکھرے ہوئے ہیں:

وہیں تک ضبطِ وحشت میں دلِ بیتاب کوشاں تھا
ترے کوچے سے ہم نکلے، تو پھر کوسوں بیاباں تھا

جتنی صفا تھی، سب رُخِ جاناں میں آ گئی
"جو داغ رہ گیا، مہِ کامل میں رہ گیا"

نہ ساغر دل کو چھیڑ میرے کہ ہونگے آلودہ دوست و داماں
سنبھل کے ساقی، سمجھ کے ناداں، بھرا ہوا جام ہے لہو کا

صنم اگر دیرِ شش جہت میں ذریعۂ یادِ حق نہ ہوتے
تو ذکر پر اُن کے شیخ و زاہد نہ بول اٹھتے: 'خدا خدا کر'

گفتگو ہے باعثِ نا اتفاقی ہائے خلق
مجتمع ہیں لب بہم، جب تک زباں خاموش ہے

کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر
اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہے اس دنیا کی راحت بھی

افکارِ مخدوم

ہم گلشنِ دہر میں اے ہمدم! آزارکشِ بیداد رہے
سبزے کی طرح پامال ہوئے، نکہت کی طرح برباد رہے

ان اشعار سے اندازہ ہوا ہوگا کہ مخدوم نے غزل کے مزاج کو پہچانا ہے، اور اس کے رنگ و آہنگ کو خوبی سے برتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں نئے استعارے، نئی تشبیہیں اور بعض خوبصورت تصویریں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کی غزلیں اس اعتبار سے توجہ طلب ہیں مثلاً "ڈوبتی کشتی کے تختے پر سونے والے" سے غافل دنیا دار کو تشبیہ دینا یا "خاموشی میں لبوں کے باہم ملے رہنے" سے گفتگو کو نا اتفاقی کا باعث قرار دینا شاعرانہ تخیل کی اچھی مثالیں ہیں؛ یا اس مصرعے کے تیور اور فضا

ترے کوچے سے ہم نکلے، تو پھر کوسوں بیاباں تھا

خدا معلوم، کتنے شاعروں نے اس مضمون کو اپنی غزل میں نظم کیا ہے، مگر اس مصرعے کی تنہائی، ویرانی، اور کیفیت اپنی آپ مثال ہے۔

غزل کا آرٹ صرف نفسِ مضمون یا لہجے کی بے ساختگی کا آرٹ نہیں ہے؛ اس کی اپنی ایک اندرونی ترتیب اور منطق ہوتی ہے۔ اس کے مصرعوں کی تراش خراش خود اپنا ایک ربط اور جواز رکھتی ہے، مثلاً مخدوم کا یہ شعر:

کس سے سنوں جو تم نہ کرو بات پیار کی
کس سے کہوں جو تم نہ سنو ماجرائے دل

یا یہ شعر:

کوہ و صحرا و ساحلِ دریا
بے ٹھکانوں کے سو ٹھکانے ہیں

ان اشعار کا مطلب شاید اور طریقے سے بھی ادا ہو سکتا ہے۔ مگر پہلے شعر میں 'سنوں' اور 'کہوں' کا ربط اور دونوں مصرعوں کے آخری ٹکڑوں کا تطابق ایک خاص قسم کا آہنگ پیدا

کرتا ہے جو فنِ تعمیر اور مصوری میں توازن اور تقابل SYMMETRY سے موسوم کیا جائے گا۔ اسی طرح دوسرے شعر میں پہلے مصرعے کا انتشار اور پھر دوسرے مصرعے کا اس انتشار کو ایک ربط اور ترتیب میں منسلک کر دینا خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ انداز و اسالیب ایسے ہیں، جنھیں پختہ مشق غزل گو شعرا کے علاوہ کوئی دوسرا آسانی سے نہیں برت سکتا۔

محروم کا تخلیقی جوہر اُن کی نظموں میں اپنے نقطۂ کمال تک پہنچ گیا ہے۔ نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلیں ان کے اس جوہر کی اعلیٰ ترین نمائندہ نہیں ہیں، لیکن ان غزلوں میں محرومؔ کے تخیّل کی بعض اعلیٰ مثالیں اور ان کے شاعرانہ تجسّس اور تفکّر کے بعض اچھے نمونے ملتے ہیں۔

ان کی ابتدائی نظموں میں ایک نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

نگاہِ ناز سے مجھ کو نہ دیکھ، پتھر ہوں
گرا نہ برقِ نظر مجھ پہ، میں سمندر ہوں

یہ نظم ۱۹۱۲ء کی ہے۔ اس وقت بھی محرومؔ پتھر تھے، نہ سمندر۔ ان کا دل اتنا سخت اور بے حس نہیں تھا کہ حسن کی اداؤں سے تڑپنے کی صلاحیت کھو چکا ہو۔ وہ دل جو گرتے کو آتار پھینکتے وقت اس کا حقِ رفاقت ادا نہ کر سکنے پر کُڑھ سکتا ہو، وہ بھلا پتھر کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس نظم میں شاید پتھر اور سمندر، سرشاری اور سرمستی کی جگہ اعتدال اور میانہ روی کی قدروں کے ترجمان کی حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں اور یہ محرومؔ کے فکر و فن کی قدرِ اول ہے۔ بے شک، وہ دردمند دل رکھتے ہیں، لیکن اس دردمندی کے ساتھ وہ سرشاری اور سرمستی اور وفورِ شوق کا اظہار نہیں کرتے؛ حالانکہ غزل گو شاعر بالعموم انھیں پر اپنی شاعری کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔ ہاں، وہ غزل کے اداشناس ہیں، اس تہذیبی وراثت کے امانت دار ہیں، جو اس صنف کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں ایسے اشعار کی اتنی فراوانی نہیں جو دل میں پیوست ہو کر ہماری خلوت و جلوت کے رفیق بن جائیں۔ مگر ان کی غزلوں کا لب و لہجہ اور ان کا سنبھلا ہوا انداز ہمارے احترام اور توجہ کا مستحق ہے۔ غزل کی مزاج دانی

اور اداشناسی اس عظیم تہذیبی وراثت کو قبول اور اختیار کیے بغیر ممکن نہیں جو ہماری مشترکہ ہندوستانی تہذیب نے بخشی ہے اور جس کی جڑیں ہندوستان ہی کی نہیں انسانیت کی بہترین قدروں تک پہنچتی ہیں۔ لہٰذا اس مضمون کے اختتامیہ کے لیے اس عرب شاعر کا اقتباس موزوں ہوگا جس نے کہا تھا:

سلامٌ علی نجد ومن حل بالنجد　　فانّھم حلوا بقلبی علی البعدٖ[1]

(سلام ہو نجد پر اور نجد میں رہنے والوں پر　　باوجود دوریِ مکان وہ میرے دل میں جاگزیں ہیں)

●●

---

[1] شعر اور ترجمے کے لیے جناب رشید احمد صدیقی کا ممنون ہوں جن کے مضامین، سے ایک کا عنوان ہے "سلام ہو نجد پر"

رباعی اور محروم

از

عرشؔ ملسیانی
ایڈیٹر آج کل
دلی

عرش ملسیانی

رباعی اور محروم

رباعی ربع سے مشتق ہے۔ یہ عربی لفظ ہے اور اس کے معنی چار ہونا کے ہیں۔ رباعی چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور ان چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ اسے مختصر ترین صنفِ سخن کہا جاتا ہے۔ رباعی کے مختلف نام ہیں: رباعی، ترانہ، دوبیتی، چہار مصرعی وغیرہ۔

پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیے کا ہونا لازم ہے؛ تیسرے میں بھی قافیہ ہو تو حسن ہے۔ رباعی کے وزن جو بحرِ ہزج سے ماخوذ ہیں چوبیس ہیں؛ لیکن چاروں مصرعوں میں الگ الگ زحاف ہونے کی صورت میں اور چوبیس اوزان کے باہم اشتراک سے بے شمار شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

رباعی اہلِ عجم کی ایجاد ہے اور رودکی اس کا موجد اور پہلا شاعر مانا جاتا ہے۔ فارسی کے مشہور رباعی گویوں میں عمر خیام اور سرمد بہت مشہور ہیں۔ بابا افضل کاشانی، بابا طاہر، سلطان ابوسعید ابوالخیر اور سحابی نجفی کی رباعیوں کا پایہ بھی بہت بلند ہے۔ ان کی رباعیوں کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

خیام:

ناکردہ گناہ در جہاں، کیست، بگو
وانکس کہ گنہ نہ کرد، چوں زیست، بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست، بگو

در مسجد اگرچہ با نیاز آمدہ ام | حقا کہ نہ از بہرِ نماز آمدہ ام
این جا روزے سجادۂ دزدیدم | آن کہنہ شداست باز باز آمدہ ام

سرمد:

سرمد، غمِ عشق بوالہوس را ندہند | سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار | این دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

آن کس کہ شراب می خورد، می گزرد | وان کس کہ کباب می خورد، می گزرد
سرمد کہ بکاسۂ گدائی نان را | تر کردہ باآب می خورد، می گزرد

ایزد بترازوے قدر با خورشید | چون جنسِ نکوئیِ رُخت می سنجید
این بسکہ گران بود، نجنبید زجا | وان بسکہ سبک بود، بافلاک رسید

افضل کاشانی:

گردون کمرے ز عمرِ فرسودۂ ماست | دریا اثرے ز اشکِ آلودۂ ماست
دوزخ شررے ز رنجِ بیہودہ ماست | فردوس دمے ز وقتِ آسودۂ ماست

گر سخت شوی، چو نیزہ بفراز ندت | ور نرم شدی، چو موم بگداز ندت
گر کج آئی، بخود کشندت چو کمان | ور راست شوی، چو تیر انداز ندت

ابوسعید ابوالخیر:

خواہی چو خلیل کعبہ بنیاد کنی | وآن را بہ نماز و طاعت آباد کنی
روزے دو ہزار بندہ آزاد کنی | بہ زان نبود کہ خاطرے شاد کنی

درکوئے خودم منزل و ماوی دادی
دربزم وصالِ خود مرا جا دادی
القصّہ بصد کرشمہ و ناز مرا
عاشق کردی و سر بصحرا دادی

حافظ کا یہ شعر اسی مفہوم کا ہے:

صبا بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہٗ مارا

طاہر عریاں:

دلے دیرم خریدارِ محبت
کزو گرم است بازارِ محبت
لباسے یافتم بر قامتِ دل
ز پودِ محنت و تارِ محبت

سحابی نجفی:

باذات بہر صفت گرایند، خوش است
نغمہ بہر آہنگ سرایند، خوش است
از بہرِ خدا ہیچ عمل ضائع نیست
در خُلد زہر در کہ درآیند خوش است

برخود درِ مدح و ذم نمی باید زد
بیرون از حد، قدم نمی باید زد
عالم ہمہ آئینۂ حسنِ ازلی ست
می باید دید، دم نمی باید زد

اردو کے قدیم رباعی گویوں میں محمّد قلی قطب شاہ اور وجہی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی زبان دکنی ہے۔ ان کے بعد سودا، میر اور درد کا زمانہ آتا ہے۔ میر کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کم جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ان کے بعد آتش، ناسخ، انشا، اور جرأت کا زمانہ ہے۔ پھر انیس، دبیر، غالب، مومن، اور ذوق کا دور آیا۔ دبیر کی مشہور رباعی ہے:

پہنچا جو کمال کو، وطن سے نکلا — قطرہ جو گہر بنا، عدن سے نکلا
تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل — پختہ جو ثمر ہوا، چمن سے نکلا

یہ رباعی علوِ خیال اور آدمی کی صلاحیتوں کی وسعت کی دلیل ہے۔ اسی مضمون کو پستی کی طرف لے جا کر امیر مینائی نے بعد میں کہا:

پوچھا نہ جائے گا جو وطن سے نکل گیا
بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

ذوق کی رباعی ہے:

اس جہل کا ہے ذوق ٹھکانا کچھ بھی — دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے، علم سے کچھ جانیں گے — جانا تو یہ جانا کہ، نہ جانا کچھ بھی

یہ رباعی خیام کی اس رباعی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے:

ہر چند دلم ز علم محروم نشد — کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نشد
واکنوں کہ بچشمِ عقل در می نگرم — معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد

ان کے بعد اکبر اور حالی رباعی گویوں میں ممتاز ہیں۔ حالی کی مشہور رباعی ہے:

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی — بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ، تو نے ہم کو چھوڑا — ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

موجودہ دور میں امجد حیدر آبادی، فانی بدایونی، یگانہ، جگت موہن لال رواں، جوش، فراق اور محروم کا نام آتا ہے۔ یہاں ہمیں محروم کی رباعیوں کا جائزہ لینا منظور ہے۔

اس دور کے رباعی گویوں کے پیشرو جگت موہن لال رواں تھے۔ ان سے متعلق فرمان فتحپوری

لکھتے ہیں :

رواں ان لوگوں میں ہیں، جنھوں نے اول اول شعوری طور پر رباعی کو اپنایا، اور اپنے ہم عصروں کی توجہ اس پس افتادہ صنف کی جانب مبذول کرائی۔ رواں کے خیالات چکبست سے ملتے جلتے ہیں۔ وطنی، سیاسی اور قومی تصورات اُن کے یہاں اکثر جھلکتے ہیں۔ ہندو تہذیب، مذہبی روایات، مقامی فطری مناظر، قومی وقار، تاریخی سانحات اور مقامی رنگ روپ کو اردو شاعری میں داخل کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ زبان کی صفائی اور لفظی صناعی پر وہ اکثر زور دیتے ہیں۔

(نگار، لکھنؤ، جنوری۔ فروری، ۱۹۵ء (اصناف سخن نمبر)

امجد حیدر آبادی صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے علَم بردار ہیں۔ یگانہ روایت شکن باتیں ایک تیکھے پن سے کہتے ہیں؛ اُن میں فکر کی گہرائی بھی ہے۔ فانی کے یہاں حسرت و اندوہ کا بیان، غم کوشی اور غم پروری ہے۔ یہ غم کو پالتے اور اس میں اپنے خیالات کو ڈھالتے ہیں۔ جوش کے یہاں طنز ہے، علوِ خیال ہے، شوکتِ بیان ہے، روایت شکنی اور عہد آفرینی ہے۔ وہ ہمہ جہت شاعر ہیں، اس لیے رباعی کو انھوں نے ہر قسم کے حسن سے مالامال کیا ہے؛ فکر انگیزی اُن کا جوہر خاص ہے۔ فراق میں بھی یہ سب جوہر موجود ہیں، بلکہ جتنی جمالیات شناسی ان کے کلام میں ملتی ہے، وہ کسی اور کے یہاں نہیں، ہندی الفاظ، تراکیب، تشبیہیں اور تلمیحیں اُنھوں نے اپنی رباعیوں میں اس طرح رچادی ہیں کہ ان میں خالص ہندوستانی پن آگیا ہے۔

فارسی میں رباعی جس معراج پر پہنچ گئی تھی، اردو والوں نے بھی اسے چھونے کی کوشش

کی ہے۔ اردو میں کوئی خیام نہ سہی، جوش اور فراق کا دم بھی مغتنمات سے ہے۔ جب ہم جوش کی یہ رباعیاں پڑھتے ہیں، تو یوں لگتا ہے کہ وہ خیام کی سرحدوں ہی کو نہیں چھوتے، بلکہ کبھی کبھی اُس سے دو قدم آگے نکل جاتے ہیں:

ہاں فردِ عمل سیاہ کرتا ہوں میں — ہر سانس میں سو گناہ کرتا ہوں میں
اِس پر بھی ہوں قدسیوں سے بڑھ کر معصوم — فطرت! تجھ کو گواہ کرتا ہوں میں

کل رات گئے، مست تھی جب موجِ نسیم — شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی شمیم
اک حور نے ساغر سے نکل کر یہ کہا — "میں روحِ مئے ہوش رُبا ہوں، تسلیم"

یہ رات گئے، عینِ طرب کے ہنگام — پرتو یہ پڑا پشت سے کس کا سرِ جام؟
"یہ کون ہے؟" "جبریل ہوں"، "کیوں آئے ہو؟" — "سرکار! فلک کے نام کوئی پیغام!"

فراق کی جمالیات پرستی اسی ایک رباعی میں دیکھیے:

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے — دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ رُوپ، یہ لوچ، یہ ترنم، یہ نکھار — بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

محروم نے اردو رباعیاں کثرت سے کہی ہیں۔ چنانچہ ان کی رباعیوں کا ایک پورا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ اب اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے؛ یہ ان کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اُن کی رباعیاں مختلف عنوانات کے تحت ہیں: حمد و مناجات، انسان، مذہب، دنیا، جذبات، فکر و نظر، پیری، شعر و شاعری، نصائح، یادِ رفتگان، واقعات و تقریبات، متفرقات اور دو آتشہ (عمر خیام کی چند رباعیوں کا ترجمہ)۔

ذرّہ شاگردِ سیّد شمس الدین فقیر کی ایک مشہور رباعی ہے:

سرما بگزشت و ایں دلِ زار ہماں | گرما بگزشت و ایں دلِ زار ہماں
القصہ تمام سرد و گرمِ عالم | برما بگزشت و ایں دلِ زار ہماں

اسی ہیئت کی یہ بلند پایہ رباعی محروم کی ملاحظہ ہو، جس میں فلسفۂ گناہ کی تفسیر ہے:

انکارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں | تکرارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں
حاصل ہو ثواب مفت، اس لالچ میں | اقرارِ گناہ بھی کیے جاتا ہوں

اُن کی اِسی مضمون کی ایک اور رباعی ہے:

ہر چند بُری میں نے روش رکھی ہے | فطرت پہ نگاہ بے خلش رکھی ہے
گر بے ادبی نہ ہو، تو اتنا پوچھوں | کیوں تو نے گناہ میں کشش رکھی ہے؟

یہ مضمون فارسی شعرا کے یہاں بہت ملتا ہے۔ سرمد کی ایک رباعی ملاحظہ فرمائیے:

از جرم فزوں یافتہ ام فضلِ تُرا | ایں شد سببِ معصیتِ بیش مرا
ہر چند گنہ بیش، کرم بیشتر است | دیدم ہمہ جا و آزمودم ہمہ را

حمد و مناجات کے عنوان کے تحت شعرا نے بالعموم اپنے کمال کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ قدیم طرزِ ترتیب کے مطابق ہر دیوان اور ہر نظم کی کتاب حمد و مناجات سے شروع ہوتی ہے۔ "بنامِ جہاندارِ جان آفریں" کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ محروم ذہنی اور عملی لحاظ سے ایک بہت ہی شریف انسان تھے۔ اُن کی شرافت کا یہ رنگ اُن کی پوری شاعری میں موجود ہے۔ نہ وہ خدا سے ملحدانہ تخاطب کے قائل تھے، نہ اُن میں اتنی بیباکی تھی۔ سیدھے سادے انداز میں اُس کی عظمت کا بیان و اقرار ان کا شیوہ تھا لیکن شاعرانہ انداز کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کے اس انداز میں بڑی مٹھاس اور عذوبت ہے۔ فرماتے ہیں:

ہر صبح بلند جب عَلَم کرتا ہے
سر تیرے حضور اٹھ کے خم کرتا ہے
لوحِ افلاک پر شعاعی خط میں
خورشید تری ثنا رقم کرتا ہے

دروازے پہ تیرے ایک جہاں جھکتا ہے
اونچے اونچوں کا سر یہاں جھکتا ہے
کیونکر نہ جھکے، زمیں کی وقعت کیا ہے
با عجز و نیاز آسماں جھکتا ہے

اس مناجات میں اُنھیں پوری انسانی نسل کا خیال آتا ہے۔ وہ خدا سے اپنے لیے نہیں، پوری دنیا کے لیے دعا مانگتے ہیں۔ وہ دنیا میں ہر طرف دغا اور فریب دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں "خدا محفوظ رکھے اس بلا سے" :

مشرق کو شدائدِ فرنگی سے بچا　　مغرب کو مکائدِ نہنگی سے بچا
اے خالقِ پاک! فطرتِ انساں کو　　روباہی و گرگی و پلنگی سے بچا

اس "روباہی و گرگی و پلنگی" کا ذکر سرمد کے یہاں بھی موجود ہے :

از مردمِ دنیا بود اندیشہ بسے　　ایں گرگ و پلنگ اندریں بیشہ بسے
مینائے دل از سنگدلاں در خطر است　　اندیشہ بود ہمیشہ زیں شیشہ بسے

سرمد کو جو اندیشہ تھا وہی اندیشہ محروم کو بھی ہے۔ اسی لیے اُنھوں نے التجا کی کہ یا رب، مشرق و مغرب کو 'شدائدِ فرنگی' اور 'مکائدِ نہنگی' سے بچا۔ چونکہ وہ فطرت سے وطن دوست اور آزاد منش تھے، اس لیے اہلِ فرنگ کے مشرق پر مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔
آدمی نے اس دنیا میں کیا نہیں کیا! زمین و آسمان کو زیر نگیں کرنے میں اس کے کمالات حیران کن ہیں اور یہ سب کچھ اس کے باوجود کہ وہ فانی ہے۔ انسان کی اس بیباکی کو محروم نے ایک خوبصورت رباعی میں بیان کیا ہے :

ہے نازشِ کائنات یہ پیکرِ خاک
دھوم اس نے مچا رکھی ہے زیرِ افلاک
یہ دارِ فنا، یہ اس کی بزم آرائی
غافل انجام سے ہے، ہائے بیباک

آدمی کی اس قدرت پر جوش بھی نعرہ زن ہے ۔ وہ بھی جدید ترین ایجادات کی بات کرتا اور انسان کو "عارفِ یک ذرّہ خاک" کہہ کر اس ایٹمی دور کی یوں تصویر کھینچتا ہے :

اُلٹے گا فلک نقاب تیرے آگے   کھل جائے گی ہر کتاب تیرے آگے
ہو جائیگا جب عارفِ یک ذرّہ خاک   جھک جائے گا آفتاب تیرے آگے

لیکن انسان اپنے ان کمالات کے باوصف اگر انسانیت کا ہمدرد نہیں، تو اس کے یہ سب کمالات بیکار اور ہیچ ہیں ۔ محروم اصل میں اس دورِ ارتقا پر طنز کرتے ہیں ۔ حرب وضرب کے اس دور میں انسان لاکھ اپنی ترقی پر ناز کرے؛ اگر اس کی ایجادات اور اس کے کمالات انسانی نسل کو آپس میں محبّت اور ہمدردی کی طرف مائل نہیں کرتے، تو یہ سب ترقّی کس کام کی ! ۔ ان دو رباعیوں میں یہی بات کہی گئی ہے :

کالا انسان ہو یا کوئی زرد انساں   رنگت میں یا ہو چاند کی گرد انساں
خارج انسانیت سے اس کو سمجھو   انسان کا اگر نہیں ہے ہمدرد انساں

پرّان ہو خواہ آسمان پر انساں   ہو خواہ سمندر کا شناور انساں
انسانیت اس میں نہیں جب تک، اے دوست!   مرغ وماہی سے ہے فروتر انساں

مذہب کا تصوّر جب ریاکاری اور سالوس ہو جائے، تو وہ مضحکہ بن جاتا ہے ۔ اسی لیے حافظ نے کہا تھا :

بیا بمکیدہ وچہرہ ارغوانی کن   مرو بہ صومعہ کانجا سیاہ کارانند

اصلی مذہب وہی ہے، جو نیکی کا درس دے، تفریق کو مٹائے، یک جہتی پیدا کرے ۔
محروم کہتے ہیں :

دنیا کے حق آگاہوں کا مذہب ہے ایک   تعلیم خدارسی کا مکتب ہے ایک
تفریق کے ہیں بہت بہانے، ورنہ   اللہ کہو کہ رام، مطلب ہے ایک!

میں نے شروع میں ذوق اور خیام کی ہم معنی دو رباعیاں درج کی تھیں، جن کا مفہوم ہے:

ع معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

محروم کی ایک رباعی بھی اسی مضمون کی حامل ہے:

راز ہستی بشر کو ہو کیا معلوم! سرگرداں عقل ہے نتیجا معلوم
باوصف ہزار علم، اُس کو اپنا آگا معلوم ہے نہ پیچھا معلوم

جہاں انسان کی انجام سے غفلت اور بے باکی کا سہارا لے کر محروم نے انسان کی صلاحیتوں کی داد دی ہے، اور اس کے کارہائے نمایاں کو سراہا ہے، وہیں اس کی بے بضاعتی سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ انسانی علم و حکمت نے حقیقت کا راز جاننے کے لیے اب تک جو کوشش کی ہے، وہ مسلّم؛ لیکن خود محروم کے قول کے مطابق ع درکنہِ رموز راہ نتوانم کرد۔ ایک پھول کی پتی تک کے رنگوں کی وجہِ تخلیق کا پتہ نہیں؛ پوری کائنات میں کیا کیا کچھ ہے، اس کی خبر نہیں۔ ابھی تو آدمی قدرت کے کرشموں سے کھیل رہا ہے۔ چاند پر پہنچنے کی کوشش بہت بڑا عزم ہے، لیکن جب ہم اس بسیط فضا کی پہنائی کا اندازہ کرتے ہیں، تو عقل و علم عاجز رہ جاتے ہیں۔ ہر چند حقیقت آشکارا ہے، علم و عقل اپنی بے بضاعتی سے مجبور و شرمندہ ہیں:

کھلتا یہ رازِ علم و حکمت پہ نہیں جب تک کرمِ خاص بصیرت پہ نہیں
معلوم ہوا ہے بعدِ فکرِ بسیار پردہ آنکھوں پہ ہے حقیقت پہ نہیں

محض خمریات اور فلسفہ اور تصوف ہی محروم کے موضوعِ سخن نہیں رہے، وہ اپنے اردگرد کے واقعات سے بھی متاثر ہو کر رباعی کہتے ہیں۔ انھوں نے خاصی طویل عمر پائی۔ آخری بیس سال انھیں دلّی میں رہنا پڑا۔ یہاں کی شہری زندگی میں انھیں ہر چیز مصنوعی ملی۔ اسی پر احتجاج کرتے ہوئے انھوں نے یہ رباعی کہی:

آٹا مصنوعی اور گھی مصنوعی مل جاتے ہیں دودھ اور دہی مصنوعی
مصنوعی ہیں سارے زندگی کے ساماں کیوں کر نہ ہو اپنی زندگی مصنوعی!

حالات آج بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہیں۔

محرومؔ کی قومی نظموں کا ایک ضخیم مجموعہ کاروانِ وطن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ذہنی اور فطری طور پر بڑے وطن پرست تھے۔ انگریزی حکومت کے اقتدار و استیلا کے خلاف وہ آواز بلند کرتے رہے اور جب کبھی انھیں موقع ملا، وہ حکومت کے مظالم کے خلاف لکھتے رہے۔ پشاور کے بازارِ قصّہ خوانی کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس بازار میں سرخ پوشوں پر گولی چلی تھی اور کتنے ہی رضا کار شہید ہو گئے تھے۔ اس واقعے کی یاد میں یومِ شہیدانِ سرحد منایا جانے لگا۔ اس تقریب پر آپ نے ایک رباعی کہی:

جو ظلم کبھی نہ دہرِ فانی میں ہوا | انگریز کے دورِ حکمرانی میں ہوا
ہر جور و ستم کی داستانوں کا نچوڑ | جو کچھ بازارِ قصہ خوانی میں ہوا

محرومؔ لمبی مدت تک راولپنڈی میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں انھیں اس شہر کو بادلِ ناخواستہ چھوڑنا پڑا۔ ان کی تین تاثّراتی رباعیاں اس ضمن میں ان کے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ پہلی رباعی 'خاکِ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر' کی مصداق ہے۔ اِس کے حرف حرف سے اُن کی اپنے وطن سے محبّت ظاہر ہوتی ہے:

نظّارۂ سرو و سمن اسی شہر میں ہے | بُوٹا سا ہر اک گلبدن اسی شہر میں ہے
یہ شہر بسا ہوا چمن میں ہے، یا | خاصیّتِ خاکِ چمن اسی شہر میں ہے

یہ رباعی انھوں نے ۱۹۳۳ء میں کہی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ترکِ وطن کرنا پڑا، تو انھیں دلی صدمہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر مجبوری نہ ہوتی، تو وہ شاید ترکِ وطن نہ کرتے، بلکہ مجبوری کے باوجود وہیں مقیم رہتے:

راولپنڈی کو، اے بسانے والو! | جنّت اس شہر کو بنانے والو!
ویرانی دیکھ جاؤ اِس کی آ کر | راولپنڈی کو چھوڑ جانے والو!

کتنی حسرت ناک رباعی ہے۔ انھیں کتنی والہانہ محبت اس شہر کے ساتھ ہے، جس میں زندگی کا

ایک طویل حصہ انھوں نے گزارا۔ اس پر حسین دانش کا یہ مشہور شعر یاد آگیا:

ہاں اے دلِ عبرت بیں، از دیدہ نظر کن، ہاں

ایوانِ مداین را آئینۂ عبرت داں

اس رباعی میں "آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں" والی بات ہے۔

اس شہر میں جو منظر انھوں نے دیکھے، وہ ہجرت کرنے والوں میں سے کم کسی نے دیکھے ہوں گے، یہ وہاں سے بہت بعد میں آئے، اس وقت شہر کی حالت کیا تھی، اس سے متعلق لکھتے ہیں:

گلیاں برباد اور کوچے ویراں دہشت زدہ چوک اور سڑکیں سنساں

خاموش مکانوں کے دریچے دیکھو جیسے کسی غم زدہ کی چشمِ حیراں

جب وہاں سے نکلے تو ایک ایسا سفر در پیش تھا جس کی منزل کا پتہ نہیں تھا۔ کہاں جائیں گے اور کہاں ٹھہریں گے، سبیلِ معاش کیا ہوگی، جنسِ شعر کا کوئی گاہک ہوگا کہ نہیں ـــ انھیں خیالات میں نکلے تو یہ رباعی کہی:

آج اپنے وطن سے جا رہا ہے محروم مامن پیشِ نظر، نہ منزل معلوم

ہنگامِ وداع ہم نے دیکھا اُس کو حسرت زدہ، دل شکستہ، حیراں مغموم

آخری مصرعے میں وہی بات ہے جو حافظ نے اپنے مشہور مصرعے میں کہی ع

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل

۱۹۵۳ء میں محروم کو پھر ایک تقریب کے سلسلے میں راولپنڈی کا دیدار نصیب ہوا۔ اس موقع پر انھوں نے تین رباعیاں فرمائیں۔ انھیں امید نہیں تھی کہ اب زندگی میں راولپنڈی دوبارہ دیکھ سکیں گے۔ اس لیے کہتے ہیں:

پھر اپنے وطن کی ہے فضا پیشِ نظر اک عالمِ نو ہے جا بجا پیشِ نظر

گزری ہوئی عمر پھر پلٹ کر آئی نیرنگِ طلسمات ہے یا پیشِ نظر

پھر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے، درد و مسرت کی ملی جلی کیفیت۔ ایسی کیفیت جس میں خوشی

بھی ہے اور رنج بھی:

جاں وقفِ الم ہے اور فرحاں بھی ہے　　دل مائلِ تسکیں بھی، پریشاں بھی ہے
راولپنڈی میں آ کے محرومِ حزیں　　فریاد کناں بھی ہے، غزل خواں بھی ہے

لیکن یہ بات انتہائی نقطۂ عروج پر اس وقت پہنچتی ہے، جب انھیں بادلِ ناخواستہ ترکِ وطن، غربت اور اس کے شدائد یاد آتے ہیں۔ وطن کی محبّت جاگ اٹھتی ہے اور پھر بلتیابانہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

اے صبحِ وطن! تیری صباحت ہے اور　　رقصاں ہر اک کرن میں طلعت ہے اور
نظّارے سے تیرے آج معلوم ہوا　　صبحِ وطن اور، صبحِ غربت ہے اور

کیا خوب کہا: صبحِ وطن اور، صبحِ غربت ہے اور۔ کوئی تنگ دل ہوتا، تو ہندوستان اور پاکستان کا قضیہ لے بیٹھتا، لیکن ایک فراخ دل شاعر وطن کے قریب آ کر یا وطن میں پہنچ کر اپنے صحیح جذبات پر قابو نہیں پا سکتا:

بعدِ مدت جب وطن کے پاس آتا ہوں کبھی
سر اُٹھا کر دیکھتے ہیں مجھ کو اشجارِ وطن

آپ نے متعدد رباعیاں اپنے دوستوں کے انتقال پر، ہم عصروں کی یاد میں اور ہم عصروں کی تقاریب کے موقع پر کہی ہیں۔ کچھ ترجمے بھی کیے ہیں۔ فارسی میں بھی چند رباعیاں ہیں۔ ایک دوست نے لاہور سے نرگس کے پھول بھیجے، یہ راستے میں کُمھلا گئے۔ اُن پھولوں کی رسید میں رباعی لکھی:

اے دوست! چہ گویمت کہ نرگس چوں مُرد
واں تازگیش ہوائے دوراں چوں بُرد
لاریب! رسید تا بہ ایں جا شاداب
چشمے بر حالِ من کشود و افسُرد!

بے مثل رباعی ہے۔ چوتھا مصرع رباعی کو پورے عروج پر پہنچا رہا ہے۔

حضرت جوش ملسیانی نے دو فارسی غزلوں پر جو الحمرا، لاہور میں شائع ہوئی تھیں، نکو در سے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اِس داد کی داد یوں دیتے ہیں:

باجوش دمیکہ شُد میسّر مارا　　از عمرِ عزیز بُود خوشتر مارا
کم یافتہ ایم ازیں نکوتر تحسیں　　دادِ سخن آمد از نکودر مارا

مخدوم نے رباعی کو محض ذہنی عیاشی کا مظہر اور ترجمان نہیں بنایا، انھوں نے اس سے بڑا کام لیا ہے۔ اُنھوں نے اس کے ذریعے سے عظمتِ انسان کا عَلَم بلند کیا ہے، بلند انسانی قدروں کی تعلیم دی ہے، زندگی کے مسائل کا ذکر کیا ہے، عالمی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، اور واقعات و تقریبات کو رباعی کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ رباعی میں مخدوم کا وہ میدان نہیں جو فارسی میں خیّام یا دوسرے شعرا کا ہے۔ ان کے ہاں وہ جمالیاتی ذوق نہیں ملتا، جو فراقؔ کا طرۂ امتیاز ہے، نہ جوشؔ کا فکری انداز اور شکوہِ بیان ہے۔ ہر گلے را رنگ و بُوے دیگر است۔ مخدوم کا امتیازی وصف ان کا نرم اور دھیما لہجہ، ان کی انسان دوستی، علوِ نفس اور خودداری ہے۔ اُن کی یہ ایسی خصوصیات ہیں، جن کے باعث ان کے دوسرے مجموعہ ہاے سخن کے ساتھ ان کی رباعیوں کا مجموعہ بھی ہمیشہ مقبول و معروف رہے گا۔ مخدوم نیک اور بلند انسان تھے۔ اُن کی شاعری کا سب سے بڑا جوہر شرافت اور پاکیزگی ہے۔ جس شاعر میں یہ جوہر ہے، اسے اور کیا چاہیے۔

●●

ہندی فارسی گوئی اور محروم

از

علی جواد زیدی

علی جواد زیدی

ہندی فارسی گوئی اور محروم

ہندستان میں فارسی غیر ملکی زبان ہے؛ لیکن اسے کلیتہً غیر ملکی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سنسکرت کی وہ بہن ہے جو ایران اور اس کے گرد و نواح میں رہ گئی۔ پھر جب ایران سے پارسی ہندستان آئے، تو وہ اپنے ساتھ "اوستا" کی قدیم پارسی لائے۔ ہندستان کی روایتی رواداری کی مظہر یہ زبان اپنے اصلی خد و خال کے ساتھ آج تک باقی ہے۔ گجرات اور مغربی سواحل کے علاوہ سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب میں فارسی کا چلن اسلام کے ابتدائی زمانے سے ملتا ہے۔ ابراہیم بن محمد اصطخری (جو ۳۴۰ھ/ ۹۵۱ء میں ہندستان آیا تھا) لکھتا ہے کہ مکران والوں کی زبان فارسی اور مکرانی ہے[1]۔ اسی طرح بشاری مقدسی ملتان کے بارے میں لکھتا ہے (۳۷۵ھ/۹۸۵ء) کہ یہاں فارسی زبان سمجھی جاتی ہے[2]۔ گویا یہ شمال مغربی علاقے کوئی ایک ہزار سال پہلے سے فارسی سے آشنا تھے۔ تقریباً سات سو برس سے شمالی ہند میں اس کے خاصے عام رواج کا پتہ چلتا ہے۔ سلطنتِ دہلی، سلطنتِ مغلیہ اور مختلف صوبائی حکومتوں کے قیام کے بعد سرکاری دفاتر اور مدارس میں ذریعۂ اظہار و درس بن جانے سے فارسی کو اور بھی بڑھاوا ملا۔

فارسی ہندستان کے عوام کی زبان کبھی نہیں رہی، لیکن پڑھے لکھے سماج میں عموماً رائج تھی۔ کلاسیکی

---

[1] مسالک الممالک (بحوالہ ہندستان عربوں کی نظر میں) : ۳۷۵

[2] احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم (بحوالہ ہندستان عربوں کی نظر میں) : ۹۰-۲۸۹

زبانوں میں سنسکرت اور عربی کی تعلیم خاصے وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔ مقامی اور علاقائی زبانیں عوام کی اپنی زبانیں تھیں، لیکن جیسی سرپرستی اور قدر دانی فارسی کی ہوئی وہ کسی دوسری زبان کو نصیب نہ ہوئی۔ درباروں میں تو فارسی بے شرکتِ غیرے حکمران تھی۔ غزنوی اور غوری بادشاہوں، دلی کے سلطانوں اور مغل حکمرانوں کی تو بات ہی کیا جو فارسی سے علاقائی نسبت رکھتے تھے، چھترپتی شیواجی، مہاراجہ رنجیت سنگھ اور مہاراجہ جے سنگھ کے درباروں میں بھی سرکاری مراسلت کی زبان فارسی تھی، فرامین فارسی میں لکھے جاتے اور وقایع نویس بھی بیشتر فارسی ہی میں تحریر کرتے۔ بڑے دربار فارسی کے منشیوں اور شاعروں سے بھرے پڑے تھے۔ چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے یہاں، بلکہ امرا اور چھوٹے رؤسا کے یہاں بھی دو ایک شاعروں اور منشیوں کی پرورش ہوتی رہتی۔ چھوٹے مدرسوں اور بڑے مکتبوں میں بھی مولوی صاحب اور پنڈت جی فارسی پڑھاتے۔ لوگ تفریحاً بھی فارسی میں شعر کہتے اور قوال، کلاونت اور "بائی جی" فارسی قطعے، رباعیاں اور غزلیں گاتیں اور سننے والوں کو محظوظ کرتیں۔ عُرسوں میں فارسی شعروں پر عوام تک کو وجد طاری ہو جاتا۔ غرض ہندستان کی ثقافتی زندگی میں فارسی ایک اہم زبان کی حیثیت سے دخیل ہو گئی تھی۔

سرکاری طور پر رائج ہو جانے سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس زبان نے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ غور تو کیجیے کہ یہاں عرب آئے اور اپنی عربی کو بھول گئے۔ ترکوں نے اپنی ترکی ترک کر دی؛ لیکن پارسی اپنی پارسی کو گلے سے لگائے رہے۔ پارسی بھی انھیں کے محدود دائرے میں گھر کر رہ گئی، لیکن جدید فارسی ہندی ثقافت کی مسلمہ زبانوں میں شامل ہو گئی۔ زمانۂ حال کے ایرانی ملک الشعرا بہار نے اپنی ایک مثنوی میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

لشکرِ یوناں از آنجا رم گرفت   عبرت از کارِ بنی آدم گرفت
شد عرب در ہند و حدت پی نگند   عاقبت آنجا عرب ہم فی نگند
ترک آنجا ترکی از سروا گرفت   فارسی بود آنکہ آنجا پا گرفت

بہار نے اس سے یہ فطری نتیجہ نکالا ہے کہ ایران اور ہندستان کے درمیان جو دوستانہ روابط

رہے ہیں، وہ فطرت کی دین ہیں:

ایزدی بود آشنائیہاے ما   آشنا داند صداے آشنا

اس سلسلے میں بہار نے نسلی اتحاد کی بھی یاد دلائی ہے:

ہند و ایران آشنایانِ ہم اند   ہر دو از نسلِ ہمایون و جم اند

میرے خیال میں فارسی کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ فارسی ہندستان میں ہمیشہ سیکولر مقاصد کے لیے استعمال کی گئی۔ اکبر نے مشترکہ سرکاری مدارس کے لیے ایسا نصابِ تعلیم بنایا، جو ہندو اور مسلمان سبھی پڑھ سکیں[1]۔ اس تعلیمی پالسی سے ہندو علما و شعراے فارسی کا ایک پورا گروہ ایسا تیّار ہو گیا، جو ہر اعتبار سے اپنے مسلمان ہم وطنوں کا ہم پلّہ تھا۔

اکبر نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اُس نے ہندو دھرم کی بعض بنیادی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروا کے مسلمانوں کو اپنے ہم وطنوں کے فکری سرمایے سے آگاہ کیا۔ اس کام میں کچھ اور سلاطین اور امرا نے بھی ہاتھ بٹایا، لیکن اس سلسلے میں ہندو شعرا اور ادبا کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ ان کی مشترکہ کوششوں سے جہالت اور ناواقفیت کی وہ دیوار گر گئی جو ملک کے ان دو بڑے مذہبی فرقوں کے درمیان حائل تھی۔ ہندستان کے مشترکہ تہذیبی ورثے کو ان لوگوں نے جس طرح بنایا اور سنوارا، وہ بھلانے کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح سے مسلمانوں کی مذہبی کتابیں بھی عربی سے فارسی میں منتقل ہوئیں اور ہندو علمار اسلام سے واقف ہوئے۔ زبان نے دلوں کو ملایا اور ذہنوں کو نکھارا۔

زبانیں کسی ایک مذہبی فرقے کی نہیں ہوا کرتیں۔ اگر اس واضح حقیقت کے لیے کوئی ثبوت درکار ہو، تو ہندستان میں فارسی کے عروج کی داستان کو غور سے پڑھیے۔ ہندستانی مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کی مادری زبان فارسی نہیں تھی۔ اُنھیں بھی فارسی کے حصول میں ہندوؤں کی طرح جتن

---

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے، آئینِ اکبری، ۱ : ۲۰۲

اور ریاض کرنا پڑتا تھا۔ مذہبی مقاصد کے لیے مسلمان عربی، ہندو سنسکرت اور دونوں ہی مقامی زبانوں کا استعمال کرتے رہے، لیکن سیاسی اور علمی کام تقریباً سب کے سب فارسی میں ہوتے تھے اور اس میں فرقوں کی قید نہ تھی؛ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ یہی سبب ہے، کہ کسی شدید تلخی کے بغیر فارسی راج سنگھاسن پر بھی بیٹھی رہی اور مدرسوں اور مکتبوں کی چٹائیوں پر بھی۔

مغل حکومت کی چمک۔ دمک میں فارسی کی محفلِ ادب میں بھی نئی چہل پہل پیدا ہو گئی تھی۔ ایران وغیرہ سے شاعر و عالم کھنچ کھنچ کر ہندوستان چلے آرہے تھے۔ صائب، کلیم، قدسی، عرفی، نظیری، ظہوری، خجندی، حزین وغیرہ شعرائے ایران کی شہرت کا دار و مدار ہی اُن کے ہندوستانی اکتسابات پر ہے۔ بیرونی حضرات کے علاوہ، ہندی نژاد فارسی گویوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد گزری۔ ابھی شاہانِ اودھ کے زمانے تک ایک ایک شہر میں فارسی کے اتنے شاعر ہوتے تھے کہ فارسی مشاعروں کا عام رواج تھا۔ ہندوستانی فارسی نگاروں کی تعداد کا احصار ممکن نہیں ہے، لیکن اِن میں سے مسعود سعد سلمان، امیر خسرو، فیضی، ابوالفضل، سرخوش، شیدا، فانی، غنی، ناصر علی، بیدل، بہار، برہمن، خوشگو وغیرہ نے خاصا نام پیدا کیا۔

شہرت پانے والوں کے مجمع میں برہمن، بہار اور خوش گو ہی تنہا ہندو نہیں، عہدِ اکبری کے شاعر مرزا منوہر توسنی کا ذکر جہانگیر نے اپنی تزک میں بھی کیا ہے۔ صاحب "نشترِ عشق" لکھتا ہے[1]:

"او اوّل شعرائے ہنود است کہ نامش تا بایران زمین رسیدہ۔ میرزا صائب مرحوم از کلام او این بیت را کہ می آید (یہاں نقل نہیں کیا گیا) پسندیدہ داخلِ بیاضِ خود نمودہ۔"

اکبر ہی کے زمانے میں اور اسی کے حکم سے رائے کرشن داس نے فارسی سنسکرت لغت بھی تیار کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں چندر بھان برہمن، رائے آنند رام مخلص، رائے

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ، "ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصہ": ۱۴۱

سرب سنگھ دیوانہ، پریم کشور فراقی، واآمت کھتری۔ بندرابن خوشگو، کشن چند اخلاص (صاحب تذکرۂ ہمیشہ بہار) آنند کن بندرابنی (مترجم بھگوت گیتا در فارسی) بھوپت رائے بے غم، لال جی تازہ، لالہ سیوا رام حیا اکبرآبادی، گربخش حضوری متھرادی، لالہ سوبھا رام دانش لکھنوی، رام جس محیط، سکھ راج سبقت لکھنوی، بال مکند شہود الہ آبادی، لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی، ٹیک چند بہار (صاحب بہار عجم)، جے کشن عشرت کشمیری (صاحب مثنوی سیتارام)، شیورام عاشق پنجابی، صاحب رام خاموش، لالہ مشتاق رائے کھتری قدرت پنجابی، (صاحب مہابھارت)، راجہ رام نرائن موزوں، راجہ مدن سنگھ موزوں دہلوی، لالہ حکم چند ندرت تھانیسری، راجہ گردھر پرشاد باقی، گیان رائے ہنر، ایسری داس (صاحب فتوحاتِ عالمگیری)، بھیم سین کالیستھ (صاحب نسخۂ دلکشا) سبحان رائے کھتری (صاحب خلاصۃ التواریخ)، امر سنگھ خوش دل، جگ جیون داس (صاحب منتخب التواریخ)، مادھو رام (صاحب انشائے مادھورام)، منشی بھوانی داس نیکو کشمیری، دیارام کاچرو خوش دل کشمیری، ڈیری کشمیری۔ یہ چند اہم نام ہیں جو بے ترتیب ذہن میں آرہے ہیں۔ اس موضوع پر کئی رسالے لکھے جاچکے ہیں۔

انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی نے فارسی کو سرکاری دفاتر سے بے دخل کردیا، مدارس میں بھی انگریزی کا غلغلہ اٹھا۔ فارسی کے اس انحطاط میں اردو کے عام رواج کو بھی بڑا دخل ہے۔ محمد شاہ کے عہد سے اردو سرکار دربار میں بھی عزت کی جگہ پاگئی اور شعرا یہ محسوس کرنے لگے کہ اب فارسی میں شاعری انھیں قبولِ عام کی سند نہیں دلا سکتی۔ مصحفی نے فارسی میں دو دیوان مرتب کیے تھے جن میں سے ایک نظیری نیشاپوری کے جواب میں تھا۔ انھوں نے اپنے بارے میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ:

"بہ نسبت فارسی گوئی در یارانِ مسلم الثبوتِ فارسی گو ہم شمردہ می شود[1]"

---

[1] غلام ہمدانی مصحفی، تذکرہ ہندی: ۲۴۸

اس کے علاوہ اُنھوں نے فارسی زبان میں شعرا کے تین مشہور تذکرے تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا اور عقدِ ثریا تالیف کیے۔ لیکن انھیں مصحفی کو یہ تسلیم کرنا پڑا:

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ

اب ہے اشعارِ ہندی کا رواج

سبکِ ہندی

اس صورتِ حال کی ذمہ داری سیاسی اور جغرافیائی حالات پر تو ہے ہی، لیکن اس کے لیے ایرانی نژاد فارسی گویوں اور فارسی نویسوں کا تکبّر بھی کچھ کم ذمہ دار نہیں ہے۔ ہندستان نے فارسی کو اُس وقت پناہ دی، جب ایران اپنے علم و ادب کی پرورش و پرداخت کی صلاحیتوں سے کم از کم وقتی طور پر محروم ہو چکا تھا۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ سولھویں اور سترھویں صدیوں میں فارسی ادب کا مرکزِ ثقل ہندستان ہی منتقل ہو آیا تھا۔ یہاں کے درباروں کی فیاضیوں کے شہرے سُن سُن کر اہلِ علم یہاں کھنچے چلے آتے تھے اور فارسی میں تصنیف و تالیف کا کام وسیع پیمانے پر ہوتا رہا۔ لیکن "اہلِ زبان" ہندیوں کے اکتسابات کا اعتراف کرنے سے گریز کرتے تھے۔ عہدِ شاہجہانی کے شاعر شیدا نے کشمیر کی تعریف میں جو مثنوی لکھی ہے، اُس کے آخر میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے[1]:

ایرانیاں مرا بہ ہندی نژاد بودن بمقدارے ننہند ... حرف آنست کہ ایرانی و ہندی بودن فخر را سند نہ گردد، پایۂ مرد بہ نسبت پایۂ ذاتی است و اگر ایرانیاں زبانِ طعن کشایند کہ فارسی زبانِ ماست، زبان را بجامِ خود نیابند۔ من بر ایشاں معنیِ رنگیں عرضہ دارم آنچہ از بے تکلفی نوشتہ شد از روے راستی ست و از راستی رنجیدن کارِ اہلِ دانش نیست۔

---

[1] حسب حوالہ جات سفینۂ خوشگو، مرآۃ الخیال، و بزم تیموریہ وغیرہ (اختلافاتِ لفظی کے ساتھ)

"اہلِ زبان" تو ایک طرف، بعض صاحبِ نظر ہندی بھی "اہلِ زبان" سے اتنے مرعوب تھے کہ کسی ہم وطن کی فارسی شاعری کو قابلِ توجہ گردانتے ہی نہیں تھے۔ خود ہندی فارسی گویوں کے ممتاز رکن، اردو کے اہم ترین شاعر اور خود ہندی الاصل ہونے کے باوجود، غالب بھی ہندیوں کے بارے میں شدید قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا تھے۔ انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے[1]:

> میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو
> دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔

غالب نے نثر ہی میں نہیں، نظم میں بھی اسی سے ملتے جلتے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ برہان قاطع پر جو جھگڑا اچھلا، اس میں غالب کے مخالفوں میں آغا احمد علی بھی تھے۔ غالب نے ان کی کتاب مؤید برہان کے جواب میں ایک نظم لکھی تھی؛ اس میں آغا احمد علی کے ہندی مصنفوں سے استناد کرنے کو غلط ٹھہرایا:

ہندیاں را در زباں دانی مسلّم داشتہ	تا چہ اندر خاطرِ والائے او جا کردہ است
با قتیل و جامع برہاں دلالہ ٹیک چند	لابہ و شوگیری و لطف و مدارا کردہ است
گر چنیں با ہندیاں دارد تولّا در سخن	من ہم از ہندم چرا از من تبرّا کردہ است

غالب کی اس ہند ناشناسی کا جواب آغا احمد علی کے شاگرد محمد عبدالصمد فدا نے دیا:

یادیم قولِ بہار آور دچوں در بعضِ جا	می نویسد، احمد او را صدرِ اعلیٰ کردہ است
اوستادے ماہرِ فن گر تحکم شد قبیح چیست	چوں بگارش را با اہلِ پارس ہمتا کردہ است

غالب جب مناظرہ پر آجاتے تھے تو مناظرہ بازوں کے سبھی پینترے استعمال کر جاتے تھے، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ہندی شعرا اور فضلا کو زبان کے معاملے میں مستند نہیں مانتے تھے۔ کسی حد تک یہ بات صحیح بھی ہے کہ فارسی کے معاملے میں اہلِ ایران کی سند ہونا چاہیے، لیکن ہندستان

---

[1] غلام رسول مہر، خطوطِ غالب: ۴۰۸ (طبع دوم)

جو خود ایک مرکزِ زبان بن گیا تھا اُس کی بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ "استعمالِ ہند" بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ خانِ آرزو نے اس پر محاکمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"آوردن الفاظِ عربیہ و ترکیہ بلکہ زبانِ ارامنہ در فارسی مسلّم است، باقی ماند الفاظِ ہندی و آں نیز بمذہب مولف دریں زمان ممنوع نیست۔"

الفاظِ ہندی سے بات محاورۂ ہندی تک پہنچتی ہے۔ ہر زبان کے محاورے پچاس ساٹھ برس میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اردو اور انگریزی کا حال ہم دیکھ رہے ہیں۔ محاوروں میں مقامی اختلافات بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً انگریزی کے انگلستانی اور امریکی محاورے باہم مختلف ہیں۔ لیکن انگریزی میں یہ محاورے تسلیم کر لیے جاتے ہیں۔ فارسی دان ہندیوں نے جب اپنے محاورے سمونا شروع کیے تو اہلِ ایران اس پر چراغ پا ہوئے۔ میرے ناقص خیال میں یہ بات مسئلہ کو نہ سمجھنے اور تنگ نظری کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ جب فارسی ہندستان میں ادبی زبان کی حیثیت سے وسیع پیمانے پر استعمال ہونے لگی اور یہاں کی علمی اور ادبی زبان بن گئی، تو اہلِ ہند کو اپنے مخصوص محاوروں کو فارسی کے سانچے میں ڈھالنے کا علمی حق مل گیا۔ لیکن یہ حق فراخ دلی سے کبھی تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ شیخ علی حزیںؔ جیسے شاعروں نے تو سوداؔ کی فارسی گوئی کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ "در پوچ گویانِ ہند غنیمت است" گویا حزیں کی نگاہ میں سارے ہندی "پوچ گو" تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی چاہیے تھا کہ اُن کی اپنی خوش گوئی کا جائزہ لیا جاتا۔ چنانچہ خانِ آرزو نے تنبیہ الغافلین میں حزیںؔ کی غلطیاں گنا ڈالیں۔

رضا زادہ شفقؔ نے ہندستانیوں کے اکتسابات کا کچھ ذکر تاریخِ ادبیاتِ ایران میں ضرور کیا ہے لیکن سبکِ ہندی کہہ کر اُن پر بھی پردہ ڈال دیا ہے بلکہ غضب یہ کیا ہے کہ سبکِ ہندی کی ابتدا امیر خسروؔ کے زمانے سے کردی ہے۔ گویا جو کچھ ہندستان میں لکھا گیا، وہ سب کا سب فارسی کے مسلّمہ طرزِ شعری سے مختلف اور ژولیدہ و پیچیدہ، صناعانہ اور بے کیف ہے۔ اس سے زیادہ کھلی ناانصافی اور کیا ہو سکتی ہے۔ کیا غزل و قصیدہ اور کیا مثنوی و نثر، ہر میدان میں اہلِ ہند کے اکتسابات باقی رہ جانے والے ہیں۔ یہ اہلِ ہند ہی ہیں جنھوں نے فارسی کو واردات و کیفیاتِ عشق و مدح کے گھروندے سے نکال کر

---

[1] المثمر: ص ۹۹ (نسخہ قلمی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

علم کی مسندِ عالی پر بٹھا دیا اور اس زبان میں وہ وسعت اور لچک پیدا کر دی کہ وہ ہر قسم کے خیالات و تصورات کو اپنا سکی۔ عشقیہ شاعری مائل بزوال ضرور نظر آتی ہے، لیکن اس میں بھی خسروؔ و فیضیؔ و غالبؔ و بیدلؔ موجود ہیں اور منظومات میں قدما میں فیضیؔ اور متاخرین میں اقبالؔ کا جواب مشکل ہی سے مل سکے گا۔ مورخین اور لغت نویسوں میں تو ہندستانیوں کا کوئی حریف نہیں ہے۔

سبھی اہلِ ایران متعصب و تنگ نظر نہیں تھے۔ موجودہ دور کے عظیم ایرانی شاعر، ملک الشعرا بہارؔ نے کھل کر اقرار کیا ہے:

آں کہ چوں سعدیؔ سخن گوئے نو است — بلبلِ گلزارِ دہلی خسروؔ است

خمسۂ خسروؔ کہ تقلیدیست فرد — با حکیم گنجوی جوید نبرد

طبعِ پاکش مایہ دارِ فکر بود — صد ہزاراں بچہ زاد و بکر بود

اور جس "سبکِ ہندی" پر شفقؔ نے دبی زبان سے ایراد کیا تھا، اس کے بارے میں بہارؔ نے یہ انصاف پسندانہ اشعار لکھے ہیں:

چو شد ایہام و مثل چوں موجِ آب — نکتہ بر ہر موج خنداں چوں حباب

کارِ تاریخ و تتبع تازہ گشت — صنعتِ انشا بلند آوازہ گشت

در لغت فرہنگہا پرداختند — نعبہا در دین و حکمت باختند

اہلِ زبان سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کی کوشش اور خواہش فطری ہے، لیکن اگر یہ نہ ملے تو افسردہ خاطر ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ فن خود ہی اپنا خراج ہے۔ اقبالؔ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے ہیں اقبالؔ کی فارسی گوئی کی عظمت واضح سے واضح تر ہوتی جاتی ہے۔ انھوں نے جن جواہر پاروں سے فارسی ادب کا دامن بھر دیا ہے، ایرانی ان کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ ان کے خیالات سے اختلاف، فنی اور لسانی اغلاط و تسامحات کی نشاندہی بھی ہوتی رہے گی، لیکن ان کی خدمات کا اعتراف بھی ہوتا جائے گا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عرب باہر والوں کو عجم (گونگا) کہتے رہے؛ اسی طرح

ایرانی بھی ہندی اور افغانی شاعروں کو اپنے مقابلے میں پست مرتبہ گردانتے رہے، انگریز یہاں کے اینگلو انڈین ادب کو دوم درجہ کا ادب قرار دیتے رہے۔ دور کیوں جائیے، لکھنؤ اور دلّی والوں نے اپنی اپنی زبان دانی کے زعم میں دوسرے شہروں میں بسنے والوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا، وہ سورج کی روشنی کی طرح عیاں ہے۔ لیکن کیا ان کوتہ بینوں کی تنگ نظری سے کاروانِ ادب رُک گیا! ایسے میں ہم اہلِ زبان کی تحسین و تصدیق کی پرواہی کیوں کریں آج جب کہ دنیا کے فاصلے سکڑتے جا رہے ہیں کوئی یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ غیر زبانوں میں لکھا ہی نہ جائے۔ البتّہ کسی غیر زبان میں لکھتے وقت ذہنی غلامی، کم ہمتی اور احساسِ کمتری کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ جس ملک میں امیر خسروؔ، فیضیؔ، غنیؔ، فانیؔ، سرخوشؔ، ناصر علیؔ اور برہمنؔ جیسی ہستیاں زمانۂ گزشتہ میں اور مرزا عبدالقادر بیدلؔ، واقفؔ بٹالوی۔ جان جاناں مظہرؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ، مرزا قتیلؔ، شفیقؔ اور خوشگوؔ جیسی ہستیاں زمانۂ متوسط میں اور غالبؔ، شبلیؔ و اقبالؔ جیسی قدآور شخصیتیں زمانۂ حال میں فارسی میں طبع آزمائی کر چکی ہیں؛ اور جس ملک کے نثر نویسوں اور شاعروں کی تعداد ہر دور میں اتنی زیادہ رہی ہے کہ ہندی فارسی گویوں کی ایک الگ تاریخ لکھی جا سکتی ہے، اُسے زبان پر براہِ راست کچھ حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں اِن حقوق کا بے باکانہ (مگر ادبی اور فنی حدود کے اندر رہ کر) استعمال کرنا چاہیے۔

فارسی گو شاعروں کی خاصی تعداد کشمیر، پنجاب، اتر پردیش، دلّی، دکن، عظیم آباد، مرشد آباد وغیرہ میں ہر دور میں مل جاتی ہے۔ اِن میں صرف غزل گو ہی نہیں ہیں بلکہ قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ، ہجو، سبھی اصناف کے لکھنے والے موجود رہے ہیں۔ کئی شعراء صاحبِ دیوان گزرے ہیں اور کئی مرتبۂ استادی پر فائز رہ چکے ہیں۔ نثر کے ذخیرے بھی گراں قدر ہیں اور متعدد علوم کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ آج تک اِن ذخیروں کو یکجا کرنے اور اُنھیں ایک رشتے میں پرونے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس کی طرف پوری اور فوری توجہ دی

جانی چاہیے، ورنہ بہت سا مواد جو مختلف ذاتی کتاب خانوں اور بیاضوں میں بکھرا پڑا ہے، وہ ضائع ہو جائے گا۔ آزادی کے حصول کے بعد کئی فارسی متون کی اشاعت کا کام ہوا ہے، مختلف مضامین بھی نکلے ہیں، لیکن ابھی تک ہندستان میں فارسی کی ایک مختصر سی تاریخ بھی مرتب نہیں ہوئی ہے۔

فارسی کی روایت اس ملک میں ایک متحرک روایت رہی ہے۔ ہمارے اکتسابات صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ فارسی بے شبہہ ایک غیر ملکی زبان ہے لیکن یہ کچھ اہلِ ہند کی خصوصیت ہے کہ وہ غیر ملکی زبانوں کو بھی اپناتے ہیں تو ان پر مصنفانہ اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ عربی اور انگریزی بھی نہ صرف بیرونی بلکہ فاتحوں کی زبانیں تھیں، لیکن جب اہلِ ہند ان زبانوں کو برتنے لگے، تو اُن کے ذہنوں میں وطنی تعصب کا شائبہ تک نہ آیا۔ فارسی اور عربی کو مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں نے بھی پالا پوسا۔ انگریزی کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے عیسائیوں ہی کی طرح توجہ کا مستحق مانا۔ ادب و زبان کے معاملے میں اہلِ ہند ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے ہمیشہ دور رہے ہیں اور بیک وقت کئی زبانوں کے حصول کو طرّۂ امتیاز سمجھتے رہے ہیں۔ مثلاً ہفت زبان اور پنج زبان ہونا نشانِ فضیلت مانا جاتا تھا۔ اس لیے ہندی، فارسی ہماری زبان ہے اور اس کی تاریخ کی تدوین ہمارا فرض۔

بیسویں صدی

بیسویں صدی برِّ اعظم ہند و پاکستان میں فارسی شاعری کے انحطاط کی صدی ہے۔ زمانہ تھا کہ یہاں فارسی کا طوطی بولتا تھا اور ہندستان کے فارسی گو زبان دانانِ ایران سے ہمسری کا دعویٰ کرتے تھے، اُن کے کلام میں لغزشوں کی نشان دہی کرتے تھے اور بعض اوقات اپنی افضلیت پر بھی دلیلیں لاتے تھے۔ لیکن اردو کی چمک دمک کے سامنے، فارسی میں شعر گوئی کی یہ حالت ہوئی گویا ایک ٹمٹماتا ہوا دیا ہو۔ اگر اقبال نے اپنی شیریں نوائی اور گہرے تفکر سے اس چراغ کے لیے نیا روغن فراہم نہ کر دیا ہوتا، تو شاید یہ بالکل ہی بجھ گیا ہوتا لیکن اس صدی کے آغاز کی بات کیوں کیجیے، آج بھی

کچھ لوگ فارسی میں مشق سخن کرتے ہیں، بلکہ صاحبِ دیوان تک ہیں۔ اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ اگرچہ فارسی میں شعر کہنے اور سمجھنے والے دونوں ہی برابر کم ہوتے جا رہے تھے لیکن اس صدی کی ابتدا تک اساتذہ فارسی میں شعر گوئی کی مشق ضرور کرتے تھے۔ فارسی ادب کے گہرے مطالعے اور کسی قدر فارسی گوئی کے بغیر ادیبوں اور شاعروں کی ادبیت مستند نہیں مانی جاتی تھی۔ اس دور میں صفی، عزیز، یگانہ اور آرزو ہوں یا سیماب، وحشت اور دل شاہجہان پوری ہوں یا تاجور نجیب آبادی، جگر مرادآبادی اور اقبال سہیل ـــــ سبھی فارسی میں بھی فکرِ سخن کرتے رہے۔ یہ سب بنیادی طور پر اردو کے شاعر تھے، لیکن منہ کا مزا بدلنے کے لیے یا فن کو نکھارنے اور اردو شاعری کو سنوارنے کے خیال سے فارسی میں بھی طبع آزمائی کر لیتے تھے۔

اس دور کی فارسی شاعری میں زیادہ تر تو قطعاتِ تاریخ ملیں گے، پھر قصیدے، پھر غزلیں۔ کچھ رباعیاں بھی مل جاتی ہیں اور کچھ متفرق موضوعات پر قطعات۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ کہیں کہیں فارسی میں طرحی مشاعرے بھی ہو جاتے تھے، لیکن یہ شاذ تھے اور ہوتے بھی تو وہاں شاعر ہی سامع ہوتے۔ امراء کے درباروں میں قصائد عموماً فارسی ہی میں پیش کیے جاتے تھے۔ اس سے اظہارِ علم و فن مقصود ہوتا تھا۔ بیسویں صدی کے فارسی قصیدہ نگاروں میں اقبال سہیل اور عبدالقوی فانی سے میں ذاتی طور سے واقف تھا، لیکن غزل نگاری کا رواج ابھی زمانۂ حال تک رہا ہے۔ حیدرآباد دکن میں 'بزمِ سعدی' کے نام سے ایک مختصر سی انجمن ابھی کچھ دنوں پہلے تک فارسی میں طرحی مشاعرے منعقد کرتی رہی ہے۔ قطعاتِ تاریخ یا چند رباعیات لکھنے والے تو اب بھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ کشمیر میں حیرت کاملی، محمد امین داراب اور فطرت کشمیری صاحبِ دیوان بھی ہیں۔ غرض اس لٹی ہوئی حالت میں بھی، اس محفل میں چند دیے ٹمٹما رہے ہیں۔

بیسویں صدی میں علامۂ اقبال کے علاوہ، کسی نے بھی فارسی کو جان بوجھ کر اظہارِ خیال کا وسیلہ بنانے کی منظم کوشش نہیں کی۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ برِ اعظم میں فارسی زبان کے جاننے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے اور اس کی نوک پلک کے سمجھنے والے تو اور بھی کم ہوتے

جا رہے ہیں۔ علی العموم فارسی گوئی سے شعراء کا بھرم علمی حلقوں میں ذرا بڑھ جاتا تھا، ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے عظیم برِّ اعظم میں فارسی شاعری گویا نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو گئی تھی۔ اقبال کا معاملہ دوسرا تھا۔ اقبال شاعر بھی تھے اور صاحب پیغام بھی۔ وہ اپنے پیغام کو شاعری سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے پیغام کا ایک پہلو آفاقی ہے اور دوسرا اسلامی۔ اسلامی پیغام کو بھی اقبال نے ایک آفاقی پیغام بنا کر پیش کیا۔ اردو ہندوستان گیر تھی، لیکن آفاقی زبان نہ تھی۔ نسبتہً فارسی زیادہ وسیع علاقے میں سمجھی جاتی تھی اور یقینی طور پر بین الاقوامی تھی۔ انھوں نے غالباً یہ محسوس کیا ہو گا کہ فارسی کے ذریعہ وہ ایک وسیع تر اسلامی حلقے میں سُنے اور پڑھے جا سکتے ہیں۔ اُنھوں نے فارسی ادب کا وسیع اور عمیق مطالعہ کیا تھا، فطرت نے انھیں گویا زبان، شگفتہ طبیعت اور رسا ذہن دیا تھا۔ پھر اُن کے یہاں فکری عنصر بہت قوی تھا۔ کہرا تفکر ایک علمی زبان کا سہارا لیتا ہے اور رومانی شاعری کی طرح روز مرّہ اور محاورہ کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ اقبال کو ٹکسالی فارسی پر جتنا عبور تھا اگر وہ نہ بھی ہوتا تو انھیں فارسی ادبیات میں مناسب مقام ملنا ہی چاہیے تھا، لیکن اقبال کی زندگی تک یہ نہ ہو سکا۔ اب اقبال کی وفات کے بعد، یہ اشعار پڑھتا ہوں کہ :

غالبی آمد اگر شد طالبی	شبلی ہست ار نباشد غالبی
بیدلی گر رفت اقبالی رسید	بیدلاں را نوبتِ حالی رسید
قرنِ حاضر خاصۂ اقبال گشت	واحدی کز صد ہزاراں برگزشت

تو مجھے بے اختیار غالب ہی کا اردو شعر یاد آجاتا ہے :

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

ہائے، اس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا !

کلامِ مخدوم

بیسویں صدی ہندستان میں فارسی کے زوال کی صدی ضرور ہے، لیکن اب بھی فارسی کے

ریا گوشے گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ کیا ہندو کیا مسلمان، سبھی فارسی کو ترک کرتے جا رہے ہیں، لیکن دونوں ہی فارسی کو برت بھی رہے ہیں۔ ہمارے ادبی اخبارات و رسائل میں اب بھی شعراء کا کلام شائع ہو رہا ہے۔ لوگ فارسی میں مضامین اور کتابیں لکھ رہے ہیں اور وہ شائع بھی ہو رہی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ تو ہوتا ہی ہے کہ فارسی پڑھنے والوں کی اب بھی خاصی تعداد موجود ہے۔ بیشتر یونیورسٹیوں میں فارسی اختیاری مضمون کی حیثیت سے اعلیٰ درجوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں فارسی کی روایت اب بھی باقی ہے اور خوشی اس کی ہے کہ ایک مشترکہ میراث کی حیثیت سے باقی ہے۔

اسی مشترکہ میراث کی آخری اہم نشانیوں میں مرحوم تلوک چند محروم بھی تھے۔ وہ سرحد میں پیدا ہوئے، بعد میں اُن کا گاؤں کٹ کر پنجاب میں مل گیا۔ اس طرح ہندی زبانوں میں پشتو اور پنجابی دونوں ہی اُن کی مادری زبانیں ہوئیں۔ زیادہ تر اُن کا قیام پنجاب اور سرحد میں رہا اور علم و ادب کے سوا اُن کا کوئی مشغلہ نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ جو تعلیم و تدریس سے بچ رہا، اُسے زبان و ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ اُن چند دنوں کو چھوڑ کر جب وہ مرضِ موت کی شدت میں مبتلا تھے، شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو، جب اُنھوں نے شعر گوئی سے منہ موڑا ہو۔

اُن کے کلام کا بیشتر حصہ اردو میں ہے۔ بچّوں کے ادب، تغزل، قومی نظمیں، اخلاقی رباعیاں، اِن سب کو ایک رشتے میں پروئے بغیر اُن کی شخصیت کا مکمل تصوّر ذہن میں نہیں آسکتا۔ اُن کی زندگی میں نہ تو بہت سے نشیب و فراز ہیں، نہ اُن کے تجربوں میں دربدری کا تنوّع۔ پھر بھی ہر وہ خیال اور ہر وہ موضوع جو اُن کے دل کے قریب تھا، نظم کے سانچے میں ڈھل ضرور گیا۔ اُن کا اردو کلام کئی ضخیم جلدوں میں مدوّن ہو کر شائع بھی ہو چکا ہے۔

محروم بنیادی طور پر اردو ہی کے شاعر ہیں اور اسی حیثیت سے جانے اور مانے جائیں گے، لیکن فارسی زبان میں بھی انھوں نے اپنے بیشتر ہمعصروں سے زیادہ ہی کہا ہے اور کلام بھی ایسا

جاندار ہے کہ اقبال کو چھوڑ کر کسی بھی ہندی ہمعصر کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ اُن کا فارسی کلام جستہ جستہ اخبارات و رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ان کے بعض اردو مجموعہ ہائے کلام میں بھی اُن کی کچھ فارسی غزلیں، کچھ رباعیاں اور کچھ قطعے شائع ہوئے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اُن کا یہ فارسی کلام بھی یکجا کر کے چھاپ دیا جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ مرتّب ہو گیا ہے اور عنقریب چھپ کر شائقینِ فارسی کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔

محروم کی فارسی گوئی کا رشتہ فانی و غنی و برہمن کی روایتوں سے جا ملتا ہے۔ اُن کا رجحان حکیمانہ اور اخلاقی مسائل کی طرف زیادہ ہے، لیکن وہ صائب و غنی کی طرح اِن مسائل کو تمثیل کے پردے میں ادا کرنے کے قائل نہیں ہیں جس سے نظر اصل مسئلے سے ہٹ کر مثال اور حسنِ تعلیل پر رک جاتی ہے۔ ان کے اشعار کا بیرونی ڈھانچہ بھی سعدی کی اخلاقی شاعری سے قریب ہے، اور معنوی اعتبار سے بھی سعدی کی طرح انھیں زیادہ شغف عام اخلاقی مسائل اور انسانی اقدار سے ہے۔ لیکن فلسفیانہ خیالات کی حدود میں وہ فانی و غنی و برہمن کی طرح ہندی فلسفہ سے یگانگت محسوس کرتے ہیں۔ وہ سادہ حقائق کو سادہ لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں؛ ان کے اندازِ بیان میں کہیں بھی ژولیدگی اور پیچیدگی نہیں ہے۔

اگرچہ محروم زیادہ تر واردات ذہنیہ کو شعروں میں ڈھالتے ہیں لیکن اُن کی غزلیں وارداتِ قلبیہ سے خالی نہیں ہیں۔ خود کہتے ہیں:

نیست اے محروم در اشعارِ من چیزے دگر
جز غمِ پنہاں کہ اظہارش بجدت می کنم

محروم بہت ہی ثقہ لوگوں میں سے تھے۔ ایک ایک قدم تول کے اٹھانا ان کا شعار رہا، اور پھر ساری زندگی درس و تدریس کے قید و بند میں گزری۔ اس لیے غزلوں میں بھی کبھی زیادہ نہیں کھلتے۔ اس کے باوجود اُن کے یہاں ایسے اشارے مل جاتے ہیں، جن سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اُن کا دل بھی کبھی کسی کے تیرِ نگاہ کا زخمی رہ چکا ہے:

محرومؔ! یادِ آں نگہِ مست زندہ باد!
بے رنجِ احتساب بمیخانہ بودہ ایم
یادِ نگہِ نازِ کسے شُربِ دوام است
مستیم و سیہ مستیِ ما بے می و جام است
یادِ مژگانت شبِ ہجراں بحسرت می کنم
یا بنشترہا علاجِ زخمِ فرقت می کنم
چرا اے آسماں کردی، غریبِ ناتوانے را
حریفِ فتنۂ چشمے کہ آشوبد جہانے را
ز مرگِ چشم ندارم سکونِ خاطر را
ہلاکِ غمزۂ آں چشمِ فتنہ سامانم

محرومؔ کی غزلوں میں بات ایک "نگاہ" سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اگر "شمعِ رخسار" کی بات آ بھی گئی ہے، تو تمنّا کی حد تک:

بیا یک شب کہ من پروانہ آسا
فدائے شمعِ رخسارِ تو باشم

اگر جلوہ گاہ میں بھی پہنچے، تو کچھ دور دور ہی نظر آئے؛ اور زلف کی بات بھی کی، تو یوں کہ شانوں پر لہرانے کا خیال دلوں میں نہ آسکے:

نادم حضورِ جلوۂ جانانہ بودہ ایم
حیرت نشینِ جرأتِ پروانہ بودہ ایم
تا زلفِ آں نگار رسیدن بما چہ کرد
از چاکِ سینہ پنجہ کشِ شانہ بودہ ایم

کمر و دہن کی بات وہ کیا کرتے! ایسے شاعر جو کمر و دہن کی بات کرتے ہیں، وہ محرومؔ

کے نزدیک لائقِ اعتنا نہیں :

تقلیدِ شاعرانِ دہان و کمر مکن
دانستہ سُوئے ملکِ عدم رہ سپر مشو

محرومؔ کی فارسی غزلوں کے مطالعے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ حُسن کے معاملے میں اُن کا حصہ "دُور کا جلوہ" ہی رہا ہے۔ حساس طبیعت نگاہ کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوئی یا پھر زلف کے پیچ وخم پر لہرا گئی۔ بعض اوقات یہ شبہہ ہونے لگتا ہے کہ انھوں نے جہاں نگاہ وزلف کی بات کی بھی ہے وہاں وہ کہیں حُسنِ مجاز میں 'حقیقت' کا جمال تو نہیں دیکھ رہے ہیں! ۔ اُن کا تصوّرِ جمال اکثر "حُسنِ مطلق" کے تصوّر کے مترادف ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب وہ کہتے ہیں :

یک جہانِ نُور پیہم می چکد از مہر و ماہ
تشنۂ نُور کدامیں دیدۂ حیرانِ ماست

حجاب از من نمی زیبد کہ من خود
نباشم تا بدیدارِ تو باشم

تب دل میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ نور اور یہ حجاب کس کا ہے ؟ بعض شعروں میں محرومؔ اِن سوالوں کا جواب بھی دے دیتے ہیں :

مخصوصِ تجلّیش نہ طوراست نہ سینا
چشمی کہ کشوداست، بر و جلوۂ عام است

کمالِ صنعتِ بُت ساز کرد حیرانم
مآلِ عشقِ بتاں غیر ازیں نمی دانم

محرومؔ یوں تو ہر شے میں ایک ہی جلوہ، یعنی جلوۂ محبوب دیکھتے ہیں، لیکن وہ مظاہر کے چہرے سے نقاب بھی اٹھنے کے متمنی ہیں :

ہزار لالہ و گل در جہاں شگفت و بماند
ستم رسیدۂ حرماں نگاہِ ویرانم

اس سے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ان کی شاعری سراسر تصوّف کی شاعری ہے؛ اُن کے یہاں تغزّل کی چاشنی کی بھی کمی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

بیا، یک شب کہ من پروانہ آسا — فدائے شمعِ رخسارِ تو باشم
زجاں رفتم من وروزے نہ گفتی — چہ غم داری کہ غمخوارِ تو باشم
ہزاراں دلستاناں دل بغارت می برند اینجا — نکو کردی، اگر دادی بہ غیبت دلستانے را
ماگذشتیم از علاجِ دردِ غم، اے چارہ گر! — دردِ ہمرازِ دلِ ما غم انیسِ جانِ ماست
نازد بخویش قطرۂ آبی کہ اشک شد — گوید بہ بہرِ کہ چنیں شو، گہر مشو

محروم کی فارسی غزل تغزّل سے زیادہ اپنے نرم حکیمانہ اور اخلاقی آہنگ سے پہچانی جائے گی۔ وہ ایسے سچّے خدا پرست ہیں کہ اُسے ہر شئے میں موجود پاتے ہیں۔ وہ خود کو سمندر کا وہ قطرہ جانتے ہیں جو اصل سے جدا ہو کر کسی اور پیمانے میں آگیا ہے، لیکن اصل سے مل جانے کے لیے بیچین ہے۔ ان کے وصال و ہجر کی داستان کو اسی پس منظر میں پڑھنا چاہیے۔ وہ ہجر کی طویل راتیں محبوب کی یاد اور پرستش میں گزارتے ہیں۔ اگر وصلِ محبوب جان دے کر بھی حاصل ہو جائے، تو کیا کہنا، بلکہ جان تو جَو کے ایک دانے سے بھی سستی ہے:

نیرزد با جوے جانِ حزینم
چہ طور اے جان! خریدارِ تو باشم

اگر وصالِ محبوب کا حصول یا جزو کا کل میں جذب ہو جانا ہی روحانی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ہے، تو اس کے لیے مناسب تدابیر ضروری ہیں۔ یہ تدبیریں عملِ خیر اور نیاز و عقیدت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہیں:

ہمین است آرزوے من کہ بوسم آستانے را
زمینِ سجدہ صد شوق سازم آسمانے را

کیونکہ یہ دنیا ایک مہمان سرا ہے جو ہر آنے والے کو لبّیک کہتی ہے، لیکن کسی کے مستقل قیام

کی روادار نہیں ہے:

بہ ہر یک کارواں لبّیک گوید منزلِ دنیا
ولیکن بر نمی تابد قیامِ میہمانے را

پھر موت ہی فراق کا علاج نہیں ہے۔ جب تک کہ وصالِ کلّی یعنی آواگون کے جھمیلوں سے نجات نہ مل جائے اور موکش حاصل نہ ہو جائے، جنونِ ہستی کو قرار کہاں:

ز مرگ چشم ندارم سکونِ خاطر را
ہلاکِ غمزۂ آں چشمِ فتنہ سامانم

ابدی سکون حاصل کرنے کے لیے محروم اس دار المکافات میں عملِ خیر کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اس پر برابر افسوس کرتے ہیں کہ ساری زندگی غفلت و عصیاں کی نذر ہو گئی:

ساحلِ امن و اماں کو، یم بہ یم عصیانِ ماست — در پئے غرقابیِ ما شورشِ طوفانِ ماست

عمرِ رواں بہ نشّۂ غفلت تمام شد — گوئی، بدورِ گردشِ پیمانہ بودہ ایم
عصیانِ ما کہ پردہ بر آنہا ندید کس — احسانِ رحمت ست کہ رسوا نبودہ ایم

حاصلِ عمرِ عزیزم جز تأسف ہیچ نیست — با خود از خود آشکارا ایں شکایت می کنم
صرفِ عصیاں شد شبِ تارِ جوانی، وادریغ — صبحِ پیری را بسر در خوابِ غفلت می کنم

اور عملِ خیر میں بھی محبوبِ حقیقی کی یاد کا مرتبہ سب سے بلند ہے:

باعثِ تسکینِ جاں یک نغمۂ اوم است وبس
دیدہ ام سامانِ غم اندر نواہائے دگر

جس غزل کا یہ شعر ہے وہ غزل میں نے محروم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہے۔ انھوں نے مصرعۂ اولیٰ کو دو طرح سے لکھا ہے۔ ایک تو وہی جیسے اوپر تحریر ہے، دوسرا اس کا بدل

ہے کہ باعثِ تسکینِ جاں یک نغمۂ 'یا ہو' ست، بس۔ محروم کی نظر میں نوائے 'اوم' اور صدائے 'یا ہو' میں کوئی فرق نہیں تھا۔

محروم پر سعدی کا کافی اثر ہے۔ رباعیوں اور قطعات میں تو یہ اثر ہے ہی، ان کی غزل میں بھی پند و نصائح اور اخلاقی تعلیم بہت نمایاں ہے:

انظارِ دیدۂ نگراں رانگاہ دار
اخیارِ دیگراں نگر و بد نگر مشو

کردار کی بلندی پر ان کی نظر ہمیشہ جمی رہتی ہے۔ واعظ کے کردار کی لغزشوں کا ذکر تو شاعر کرتے ہی تھے، لیکن محروم نے اس سلسلے میں شاعر تک کو نہیں بخشا:

تو گفتی فلاں شاعرِ خوش نواست ولے صاحبِ حسنِ کردار نیست
مدار از سخنور امیدِ عمل کہ اورا ہنر جز بگفتار نیست

یہ بات اور ہے کہ وہ شعر کو خود ایک عملِ نیک جانتے ہیں۔

محروم قطعات و رباعیات میں قدم قدم پر اپنی خدا پرستی، شرافتِ نفس اور خیر دوستی کے مظاہرے کرتے ہیں۔ انھوں نے بیدادگری اور ظلم کے خلاف کئی جگہ آواز اٹھائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس دور کی سیاستِ فرنگ کو نشانہ بنائے ہوئے تھے، لیکن فارسی کلام میں ان کی قومی شاعری کا وہ کھلا ہوا رنگ نہیں ہے جو اردو میں نظر آتا ہے۔

ایک رباعی میں محروم نے اُن تمام خواہشاتِ نفسانی کا ذکر کر دیا ہے جو انسان کے وجود سے وابستہ ہو کر اُس کے دشمنوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے ان کی تعداد پانچ بتائی ہے۔ کام (شہوت)، کرودھ (غصّہ)، لوبھ (حرص)، موہ (دل بستگی) اور اہنکار (خودی)۔ اِن میں سے تین یعنی شہوت، غصّہ اور حرص کے بارے میں

تو سبھی متفق ہوں گے، البتہ دل بستگی اور خودی کے بارے میں شاید کسی کو اختلاف ہو۔ لیکن اگر ہم ان کے تاریک پہلوؤں پر نظر رکھیں تو شاعر کی رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ ان پر اعتراض قدیم اخلاقی نظریات کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں ان کے سماجی اور اقتصادی محرکات کی جستجو کی جاتی ہے اور اب خرابی کی جڑ کو دور کرنے پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔

قطعات و رباعیات میں بہت سی رباعیاں تو واقعات و حوادث سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں، کچھ ادبی شخصیتوں یا دوستوں سے متعلق ہیں۔ اُن کا ذکر طولِ کلام کا باعث ہوگا، لیکن اس سارے مجموعے میں وہ سات رباعیاں جن میں انھوں نے آفریدگار سے چند سوالات پوچھے ہیں، خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ان میں شاعرانہ خوش گفتاری بھی ہے اور نزاکتِ احساس بھی۔ ایک طرف حُسن کا دلکش نظارہ ہے اور دوسری طرف کوئی کھٹک، کوئی کسک۔ پھول کے پہلو میں خار، کچھ عام تضادات۔ دیکھیے:

چمن در بر حسیناں آفریدی — سمن بر نازنیناں آفریدی
نظر انداختم چوں بر رخِ شاں — زہر سُو نکتہ چیناں آفریدی

بتانِ ماہ سیما آفریدی — نگارانِ خود آرا آفریدی
دل و دیں گرچہ شد تاراجِ ایشاں — چساں گویم کہ بیجا آفریدی

فضائے نوبہاراں آفریدی — نوائے نغمہ باراں آفریدی
کدامیں جُرمِ ما دیدی کہ مارا — برائے سوگِ یاراں آفریدی

جن ادبی شخصیتوں کے بارے میں محروم نے فارسی میں لکھا ہے اُن میں غالب، اقبال،

خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، جوش ملیح آبادی اور جوش ملسیانی قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بھی انھوں نے سب سے زیادہ رباعیاں اقبال کے متعلق لکھی ہیں۔

محروم نے کچھ تضمینیں بھی کی ہیں۔ ان میں نظامی گنجوی کی مناجات کی تضمین مثلث کی شکل میں نسبتہً طویل ہے۔ باقی زیادہ تر ایک ایک بند کے مخمسوں کی صورت میں ہیں۔ اقبال کے دو فارسی مصرعوں کی تضمینیں بھی انھیں میں شامل ہیں۔

ان کی فارسی نظموں میں 'مناظرہ' سب سے اہم ہے۔ یہ مناظرہ علامہ اقبال اور ایک فرضی ملاّ، ملاّ کمال کے مابین ہے۔ ملاّ کمال ایک تنگ نظر، ظاہر پرست ملاّ ہے، جس کے ذہن میں اسلام کا ایک نامکمل سا تصور ہے اور وہ دوسرے مذاہب کی خوبیوں کو بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اس کے مقابلے میں اقبال مذاہب کی بنیادی وحدت کے قائل ہیں اور اسلام کو دینِ فطرت اور مذہبِ انسانیت کے روپ میں دیکھتے اور مانتے ہیں۔ وہ شیخ و برہمن کی فرضی تقسیم کے قائل نہیں ہیں۔ یہ ملاّ کمال اپنے غم و غصہ میں اس حد تک چلا جاتا ہے کہ

خدائے پاک را گر بندہ ہستی　　　بنائے دیرِ ہندی را بر انداز

اور اقبال پر یہ اعتراض کرتا ہے:

برہمن را ستائش گر چرائی　　　چہ خیرست اندریں مدحت سرائی
نمی بینی کہ آں فرسودہ ہمت　　　بہ لختِ سنگ می جوید خدائی

مُلّائے ظاہر پرست کو تعجب ہے کہ اقبال کفر و اسلام کے درمیان امتیاز نہیں کر پاتے اور دونوں سے بیک وقت نباہ کرنے کی سوچتے ہیں:

دلِ معنی فروزت طرفہ مضراب　　　کہ می سازد بسازِ کفر و اسلام

اس کے مقابلے میں اقبال جو دلائل پیش کرتے ہیں، ان سے بلند نظری اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ

ہوتا ہے:

مرنج از برہمن، اے واعظِ شہر! | گر از ما سجدۂ پیشِ بتاں خواست
خدائے ما کہ خود صورت گری کرد | بتے را سجدۂ از قُدسیاں خواست

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت | فروغِ زندگی تابِ شرر بود
ولیکن گر نہ رنجی با تو گویم | صنم از آدمی پائندہ تر بود

درِ صد فتنہ را بر خود کشادی | دو گامے رفتی و از پا فتادی
برہمن از بتاں طاقِ خود آراست | تو قرآں را سرِ طاقے نہادی

تراشیدم صنم بر صورتِ خویش | بشکلِ خود خدا را نقش بستم
مرا از خود بروں رفتن محال است | بہر رنگے کہ ہستم، خود پرستم

تو اے شیخِ حرم! شاید ندانی | جہانِ عشق را ہم محشرے ہست
گناہ و نامہ و میزاں ندارد | نہ اُو را مسلمے، نے کافرے ہست

کنشت و مسجد و میخانہ و دیر | جُز ایں مشتِ گِلی پیدا نکردی
زحکمِ غیر نتواں جز بدل است | تو اے غافل، دلے پیدا نکردی

جب علامہ اقبال وطنی شاعری سے دست بردار ہوکر، شاعرِ اسلام کی حیثیت سے نمودار ہوئے، تو اُن کے مدّاحوں کے ایک بڑے حلقے میں اُن کے اِن نظریات سے بے چینی پیدا ہوئی۔ اُن کی اِس تبدیلی پر بہت اعتراض ہوئے ہیں اور لوگوں نے اس سے متعلق بہت

کھل کر لکھا ہے، حتیٰ کہ اسے فرقہ پرستی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ محروم خود قومی شاعر ہیں اور دل میں
قومی درد رکھتے ہیں۔ یہ محروم کے کردار کی بلندی ہے کہ خیالات کے اس ٹکراؤ کے باوجود انھوں
نے اقبال کو فرقہ پرستی کے اس الزام سے بچایا ہے۔ ملّا کمال کے کردار کی تخلیق سے انھوں نے
اقبال کے اشعار کو توانا معنویت دی ہے اور ان کی وسیع المشربی کو اُجاگر کیا ہے۔ محروم کے
اشعار اقبال کے اشعار کے پہلو بہ پہلو رکھے ہوئے قطعاً بے محل پیوند نہیں معلوم ہوتے۔
میں کہہ چکا ہوں کہ محروم نے فارسی میں بہت کم لکھا ہے، جتنا بھی لکھا ہے اُس سے صاف ظاہر
ہے کہ انھیں فارسی زبان پر بھی ماہرانہ قدرت حاصل تھی۔ اتنے مختصر مجموعے میں رجحان اور طرز و
اسلوب کی تلاش تو بے سُود ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ اردو کی طرح فارسی میں بھی محروم سادہ گوئی
کو پسند کرتے ہیں۔ تجربوں کی دھیمی آنچ پر گداختہ خیالات، اور سہل ممتنع انداز میں جداگانہ آہنگ
ہے اور یہی آہنگ محروم کے فارسی کلام کا امتیازی نشان ہے۔
یہ کہنا مشکل ہوگا کہ محروم کا فارسی کلام اُن کے اردو کلام کے ہم پلّہ ہے اور اس کی نوک پلک
بھی اسی طرح سنواری گئی ہے۔ غیر زبان کے محاوروں پر اہلِ زبان کی طرح اقتدار رکھنا آسان
نہیں، لیکن یہ بھی کچھ کم قابلِ تعریف بات نہیں ہے کہ غیر زبان میں اتنے گوارا انداز سے شاعری
کی جائے اور وہ اسقام و زوائد سے اس حد تک پاک صاف ہو جائے۔ محروم کی فارسی شاعری
کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ انھیں ایسا زمانہ ملا، جب فارسی شاعری ہی نہیں
بلکہ فارسی دانی بھی ہندستان میں مائل بہ زوال تھی۔ فارسی شاعری محروم کے تاج میں
ایک اور گوہر ضرور ہے، لیکن یہ اُن کا طرّۂ امتیاز نہیں؛ یہ فخر اردو کلام ہی کو حاصل رہیگا۔
غالب سے معذرت کے ساتھ، ہم محروم کی زبانی کہہ سکتے ہیں ؏

اُردو ہم ہیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ

●●

محرومؔ کی قومی شاعری

از

گوپی چند نارنگ
ایم اے، پی ایچ ڈی
دلّی یونیورسٹی، دلّی

گوپی چند نارنگ

محرومؔ کی قومی شاعری

تلوک چند محرومؔ کا نام زبان پر آتے ہی خیال اردو کے ان بزرگ شاعروں کی طرف جاتا ہے جنھوں نے حالیؔ اور آزادؔ سے نظم کی شمع ہاتھوں ہاتھ لے کر اردو کے ایوانِ شاعری کو اس کی روشنی سے جگمگا دیا تھا۔ ان میں اسمٰعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی، اکبر الہ آبادی، شوقؔ قدوائی، چکبستؔ، اقبالؔ، کیفیؔ اور محرومؔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کی کوششوں نے نظم کو ایسی جِلا دی کہ وہ غزل سے آنکھیں ملانے لگی۔ جو لوگ شاعری کو محض حسن و عشق سے عبارت سمجھتے ہیں اور اسے تہذیبی و سماجی عوامل سے آزاد قرار دیتے ہیں، انھیں شاید محرومؔ کی شاعری میں اپنی دلچسپی کی کوئی چیز نہ ملے، کیونکہ محرومؔ نے ہمیشہ شاعری کے سماجی اور اجتماعی منصب کو تسلیم کیا اور یہی جذبہ ان کی نظم گوئی کا محرک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری کی معراج حسنِ محض ہے، لیکن جب وطن کا چپّہ چپّہ دکھ اور درد کی تصویر بنا ہوا ہو، اور دلوں میں آزادی کی آگ بھڑک رہی ہو، تو اپنی ذات سے توجّہ ہٹ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں شاعری اپنا مقصد آپ ہی نہیں رہتی، بلکہ اس سے جہدِ آزادی کے لیے فضا تیار کرنا اور بہتر مستقبل کی تمنا کرنا بھی شاعر کا فرض ہو جاتا ہے۔ محرومؔ نے شاعری کے اسی نظریے کو تسلیم کیا اور ساری عمر اسی رَوِش پر گامزن رہے۔

بظاہر اُن کی شاعری ہمہ رنگ ہے۔ انھوں نے پہاڑوں اور دریاؤں کے گیت گائے ہیں؛ ابھرتی ہوئی کرنوں کا استقبال اور ڈوبتے ہوئے ستاروں کا ماتم کیا ہے؛ دل کی وارداتوں اور فراق کی راتوں کے نغمے سنائے ہیں، گائتری، ویدوں کے منتر اور بھرتری ہری

کے اقوال دہرائے ہیں؛ غزل، رباعیاں اور قطعے بھی لکھے ہیں؛ اور علم و دانش کے رموز و نکات بھی بیان کیے ہیں۔ غرض، ان کے ہاں منظری، بیانیہ، اخلاقی، حکیمانہ، عاشقانہ ہر طرح کا کلام ملتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا اپنا کوئی خاص رنگ ہی نہیں۔ اُن کے کلام کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس کی تہ میں ایک گہرا لیکن تھما ہوا درد ہے، مجروح احساس کی درد انگیزی ہے، ایک بے نام سی بے چینی اور دبی دبی سی شورش ہے۔ یہ شورش پیدا ہوئی ہے، انسانی قدروں کی پامالی سے اور یہی محروم کا انفرادی رنگِ سخن ہے۔ انسان کو اخلاقی طور پر اُستوار، مُلک کو آزاد اور قوم کو خوشحال دیکھنا ہی ان کی سب سے بڑی تمنا ہے؛ اور یہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ وہ وسیع معنوں میں انسانیت کے شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں تقریباً نصف صدی سے مدارس کے نصاب میں شامل رہی ہیں، اور اس لحاظ سے انھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت میں اہم حصہ لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی شاعری میں جن عناصر پر خاص زور دیا گیا ہے، ان سے کردار کی تعمیر میں مدد ملتی ہے۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ محروم کی شاعری انسانیت کی بنیادی قدروں کی شاعری ہے؛ شرافت و صداقت، حق گوئی و حق پرستی، غیرت و حمیت، اتحاد و رواداری، مہر و وفا، ایثار و کرم کا انھوں نے اپنے کلام میں بار بار ذکر کیا ہے۔ لیکن اُنھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ غلامی ان سب کی نفی ہے۔ اسی لیے اُن کی شاعری غلامی اور محکومیت کے خلاف سینہ سپر نظر آتی ہے، اور وطن کی آزادی کا راگ ان کی شاعری کی بنیادی آواز بن گیا ہے۔ یہ محض ذاتی مسرتوں یا غموں کا ترانہ نہیں، بلکہ اس کا رُخ پورے ملک اور قوم کی طرف ہے۔ اگر ملک اور قوم کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنا بھی شاعر کے فرائض میں شامل ہے، تو محروم کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں۔ یہاں ان کے رنگِ سخن کے صرف اسی پہلو یعنی ان کی قومی شاعری کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

تلوک چند محروم ۱۸۸۷ء میں دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں عیسیٰ خیل میں

پیدا ہوئے۔ شاعری کا ملکہ فطرت سے ودیعت ہوا تھا۔ ابھی طالب علم ہی تھے کہ سامراجی لوٹ کھسوٹ اور وطن کی زبوں حالی کا انھیں احساس ہونے لگا۔ ان کی ابتدائی نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نے آنکھ ہی اس دعا کے ساتھ کھولی تھی:

اخترِ ہند کو ہم اوجِ ثریا کر دے

۱۹۰۶ء کی ایک نظم میں ہندستان کی خواری و ذلت اور پامالی و بربادی کی خاصی مؤثر تصویر کھینچی ہے اور ہر بند کے بعد پوچھا ہے۔ "تم کو معلوم ہے، کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟" نظم کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ سترہ اٹھارہ برس کی عمر ہی میں محروم نے سامراجیت اور خود مختاری اور آزادی و غلامی کے بنیادی مسائل پر سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے مصرع "اسیر و اکر دو کچھ رہائی کی باتیں" کو بھی تضمین کیا اور اپنے ہم وطنوں کو نئی زندگی کی بشارت دیتے ہوئے کہا کہ اب کے فصلِ بہار نئی شان سے آئی ہے اور ضرورت ہے کہ سنگِ اسیری کو ہمیشہ کے لیے سینے پر سے اٹھا پھینکا جائے۔ ایام طالب علمی کی نظموں میں ایک اور قابلِ ذکر نظم "لٹل جون" ہے۔ اس میں محروم نے ایک فرنگی بچے کے ساتھ اپنی گفتگو کا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انھوں نے آزاد قوم کے ایک چھوٹے سے بچے کا دل بھی حبِ قومی کے جذبات سے لبریز پایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کی اقتصادی اور معاشی بدحالی کا راز کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا اور سودیشی تحریک کی ابتدا ہوئی تھی؛ محروم نے بھی اس پر لبیک کہا اور سودیشی تحریک کے پیغام کو عام کرنے کے لیے کئی نظمیں لکھیں۔

محروم کی ایسی نظمیں ان کی صحیح اٹھان کا پتہ دیتی ہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کا کلام مخزن اور زمانہ میں شائع ہونے لگا تھا۔ اردو شاعری کی دنیا میں اس وقت سب سے بلند اور مؤثر آواز اکبر اور اقبال کی تھی۔ محروم نے ان دونوں کا اثر لیا، لیکن ان کے اور اکبر و اقبال کے نظریوں میں بڑا فرق تھا۔ اکبر مشرقیت کے پرستار تھے اور ماضی پرستی کی وجہ سے تاریخ کے دھارے

کا صحیح رُخ پہچاننے سے قاصر تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی بیشتر جدید تحریکوں کی جوان کے زمانے میں قوم اور ملک کی ترقی کے لیے اٹھیں، مخالفت کی۔ اگر وہ "مدخولۂ گورنمنٹ" نہ ہوتے، جب بھی نئی تبدیلیوں سے متعلق ان کا رویہ بدلنے والا نہیں تھا۔ ان کے مزاج کی افتاد ہی ایسی تھی کہ وہ ہر ایک تبدیلی کو شک وشبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انگریز کی واضح سیاسی چالوں کو دیکھتے ہوئے بھی وہ تحریکِ آزادی کو لغو سمجھتے رہے۔ فرماتے ہیں:

ہرگز نہ مستقل سمجھ اس انقلاب کو

رکھ راہِ راست، بھونکنے دے اِن کلاب کو

محروم عمر میں اقبال سے چودہ برس چھوٹے تھے۔ ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ محروم اپنی راہ متعین کرنے لگے تھے اور یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال ہمالیہ اور نیا شوالہ کے دور سے گزر چکے تھے۔ سرور جہاں آبادی اگرچہ اقبال سے چند سال بڑے تھے، اور قومی اور وطنی شاعری میں ان کے پیش رَو بھی، لیکن ان کا عین جوانی ہی میں انتقال ہو گیا (۱۹۱۰ء)۔ چکبست البتہ اس زمانے میں خوب خوب لکھ رہے تھے، قومی شاعری کے افق پر ان کی آواز ایک روشن ستارے کی طرح نئی صبح کا پیغام دیتی ہوئی اُبھر رہی تھی۔ غرض جب محروم کی شاعری اپنی سمت کا تعین کرنے لگی، ان کے سامنے سرور اور اقبال کی چند نظموں یا چکبست کی ابھرتی ہوئی آواز کے سوا کوئی اور نشانِ راہ نہ تھا۔ محروم نے انھیں چراغوں سے چراغ جلایا اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگ گئے۔ اُن کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے اردو شاعری میں مُلکی اور قومی عنصر پر ایسے نازک وقت میں توجہ کی، جب اردو کے اکثر شاعر یا تو اپنے قومی منصب سے بےخبر تھے یا تحریکِ آزادی میں شریک ہونے سے کترا رہے تھے۔ محروم نہ صرف اس کارزار میں دل وجان سے شریک ہوئے، بلکہ اس کے لیے اُنھوں نے ہر طرح کے خطرات کا بھی سامنا کیا۔ وہ نیم سرکاری ملازم تھے اور ایک مدت تک ان پر سی۔ آئی۔ ڈی کی نگرانی بھی رہی۔ چنانچہ اس زمانے میں اُن

کا کلام بغیر نام کے یا فرضی ناموں سے رسائل و جرائد میں چھپتا رہا۔ ان کے مجموعے میں "صحرا نشین" کے نام سے چند نظمیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ بعض نظمیں کہیں بھی شائع نہ ہو سکیں اور پہلی مرتبہ آزادی کے بعد منظرِ عام پر آئی ہیں۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے لے کر حصولِ آزادی تک ہماری تحریکِ آزادی کو کئی موڑوں سے گذرنا پڑا۔ اس پورے سفر کی داستان، اپنی امیدوں اور ارادوں، کامیابیوں اور ناکامیوں اور سود و زیاں کے ساتھ مخدوم کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر تک آزادی کی تحریک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اور صنعتی منافع خوروں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ انگریزوں کی انصاف دوستی کے قائل تھے، اور قوم و ملک کی ترقی کے لیے اُن سے اصلاحی نوعیت کی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں کے مقاصد کا راز طشت از بام ہونے لگا تو حریت پسندوں کی بڑی تعداد سمجھوتے کی راہ سے ہٹ کر تشدد آمیز طریقوں پر اُتر آئی۔ تقسیم بنگال اور لارڈ کرزن کی جابرانہ روش نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ جس نے عوام کو اور بھی مشتعل کر دیا اور ملک بھر میں دہشت پسندوں کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ حکومت نے ان تحریکوں کو کچلنے کی جتنی کوشش کی، یہ اتنا ہی زیادہ بڑھیں۔ غم و غصہ کی اس فضا میں رہی سہی کسر رولٹ بل نے پوری کر دی۔ اِس کے خلاف ہندوستان کے سب طبقوں نے متفقہ طور پر احتجاج کیا۔ جگہ جگہ ہڑتالیں ہوئیں، مظاہرے کیے گئے، اور جلوس نکالے گئے۔ امرتسر میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ کے پُرامن جلسے پر جنرل ڈائر نے گولیوں کی باڑ جھونک دی، جس سے چار سو آدمی لقمۂ اجل ہو گئے، اور ایک ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اس خوں چکاں حادثے کے بعد انگریزوں سے نفرت کا جذبہ شدید سے شدید تر ہو گیا۔ عوامی تحریک کو دبانے کے لیے حکومت نے پنجاب میں دو ماہ تک مارشل لا نافذ کر دیا۔ خبروں کے سنسر کا یہ عالم تھا کہ جلیانوالے باغ کے حادثے کی اطلاع لندن میں آٹھ مہینوں

کے بعد پہنچی۔ اس حادثے کا اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ اس کے بعد سے تحریکِ آزادی صحیح معنوں میں ہمہ گیر اور عوامی ہوگئی؛ اب ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگ اِس میں شامل ہوگئے۔

جلیانوالے باغ کا حادثہ ہمارے سفرِ آزادی کا ایک بڑا ہی دردناک حادثہ ہے۔ شہید ہونے والے چار سو ہندوستانیوں نے قربانی کی ایسی مثال قائم کی کہ اس ایک چراغ سے کئی چراغ جل اٹھے، مخدوم نے اس سے جو اثر لیا، وہ بہت کم شاعروں کے حصے میں آیا۔ انھوں نے اس سے متاثر ہوکر کئی نظمیں لکھیں، یہ سب کی سب انگریزوں سے نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی ہیں، اور ان کے ظلم اور استبداد کے خلاف دردناک احتجاج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

نادر کا قتلِ عام ہے مشہور آج تک
سفاک اس کا نام ہے مشہور آج تک

لیکن ہے جورِ نادرِ سفاک سے سوا
ڈائر کے قتلِ عام کا پرہول ماجرا

اس نے کیا تھا قتل رعایائے غیر کو
جو ہو چکی تھی جنگ میں خود اس کے روبرو

ڈائر نے قتلِ عام کیا اُس مقام پر
مرتے جہاں ہیں لوگ اطاعت کے نام پر

یورپ لہو سے جن کی ابھی لالہ زار ہے
اب تک ہوائے دشت میں جن کا غبار ہے

اُن ہی کے بھائی بند تھے اُس باغ میں جہاں
ساون کے بادلوں کی طرح برسیں گولیاں

شامل تھے اُن میں پیر بھی اور خوردسال بھی
دل میں کسی کے تھا نہ خطر کا خیال بھی

میلہ سمجھ کے باغ میں داخل ہوا کوئی
جمگھٹ عجیب جان کے شامل ہوا کوئی

نکلا تھا کوئی لوٹنے فصلِ بہار کو
آغوش میں لیے تھا کوئی شیرخوار کو

تھی درمیانِ باغ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ
ناگاہ اک طرف سے چلی گولیوں کی باڑ

پھر وہ ہوا کہ جس سے لرزتی ہے تن میں جاں
پتھر کا دل بناؤں، تو کچھ ہو سکے بیاں

ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا
لوہو سے لال دامنِ برطانیہ کیا

(ڈائر اور نادر)

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۳ء تک کا زمانہ ہندو مسلم اتحاد کے عروج کا زمانہ تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں برطانیہ نے ترکی کے خلاف علَمِ جنگ بلند کروایا۔ اِس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات عام ہونے لگے اور وہ بھی ہندوستان سے انگریزی حکومت کے ختم کرنے میں پوری طرح کانگرس کے ہم نوا ہو گئے۔ مقصد کے اس اتفاق سے خلافت تحریک کا آغاز ہوا، جس نے انگریز دشمنی اور آزادی کے جذبے کو ملک کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔ ہندو مسلمان دونوں کو احساس ہونے لگا کہ ان کے باہمی اتّحاد اور اتّفاق میں زبردست طاقت ہے۔ لیکن محبت اور آشتی کی یہ فضا زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی، ترکِ موالات کے دوران میں جو اختلافات عارضی طور پر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے، اتّحاد کے ختم ہوتے ہی وہ پھر سے نمودار ہو گئے، اور دونوں قوموں میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ ان حالات میں محروم نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا:

وعدے تھے اتحاد کے، دعوے خلوص کے — کیا ہو گیا وہ عہد، وہ پیماں کدھر گیا

آتا نہیں ہے نعرۂ پُر جوش تا زباں — پہلو میں یک بیک دلِ شوریدہ مر گیا

آخر ہوا ہے دردِ وطن کا علاج کیا — جس سے تمام گریۂ شام و سحر گیا

حالت سے اپنی ہو گئے غافل ہم اس طرح — جادو کسی پہ کوئی ہو جس طرح کر گیا

کیا مطمئن ہیں اہلِ وطن، دیکھیے ذرا — گویا گلے سے طوقِ غلامی اتر گیا

(انجامِ اتّحاد)

ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اتّحاد اور اخوت بڑھانے کے لیے محروم نے کئی نظمیں کہی ہیں، ان میں انگریزوں کی حکمتِ عملی کی طرف اشارے ہیں، نفاق کی برائیوں اور اتفاق کی خوبیوں کا بیان ہے، متحد ہو کر آزادی کی جنگ جیتنے کی بشارت ہے۔ "ہندو مسلمان" محروم کی ایک طویل نظم ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر ہم غافل، بے خبر اور بے غیرت ہیں، تو ہمیں ہندوستانی کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ ہندو یا مسلمان صرف وہی ہے جس کا

کردار صالح ہے اور جس کے دل میں مذہب کی محبت کے ساتھ ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ بھی موجزن ہے۔

آزادی کی منزل سر کرنے کے لیے محرومؔ نے سب سے زیادہ زور قومی اتحاد و یگانگت ہی پر دیا ہے۔ ایک جگہ آزادی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہے فقط اتحاد کا انعام

محرومؔ نے پھوٹ، نفاق، تنگ نظری، تعصب اور فرقہ واریت کی سخت سے سخت الفاظ میں مذمت کی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے شعور اور احساس کی پوری قوت سے ان سماج دشمن برائیوں کا سدِ باب کریں، تاکہ ہندستان ایک بار پھر گوتم اور نانک اور چشتی کے روح پرور نغموں سے گونج اٹھے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ قومی اتحاد و یگانگت کے موضوع پر جتنا اور جیسا محرومؔ نے لکھا ہے، اتنا اور ویسا کسی نے نہ لکھا ہوگا (ملاحظہ ہو: "آئینۂ حال"، "پھر بھی لڑتے ہیں" "قافلے یوں بھی تلف ہوتے ہیں"، "انقلابِ دہر"، "پیامِ صلحِ کل"، "یادِ اتحاد"، "اہلِ وطن کی خدمت میں") محرومؔ نے اپنے ہم وطنوں کی ہنگامہ آرائیوں اور تفرقہ پردازیوں کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کے چرکے بھی سہے تھے۔ ان نظموں میں جگہ جگہ دل کے داغوں کی لو آتی ہے۔ "پیامِ صلحِ کل" میں انھوں نے ہندو مسلمانوں کے افتراق کا ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر طرف مہر و وفا اور صدق و صفا کا قحط ہے، لوگ خود امن و امان کے دشمن ہو رہے ہیں، اور اپنی ذلت و بربادی کو دعوت دے رہے ہیں۔ باہمی فسادات پر محرومؔ کے یہ اشعار دل سے اٹھی ہوئی ٹیس کا درجہ رکھتے ہیں:

دورِ زماں جو دشمنِ امن و اماں ہوا
برہم نظامِ کشورِ ہندوستاں ہوا

جینا یہاں کا باعثِ آزارِ جاں ہوا
دوزخ نما یہ خطۂ جنت نشاں ہوا

کیا انقلابِ دہر کدورت فشاں ہوا
بادِ سحر چلی، تو بگولا عیاں ہوا

گھیرا تمام ملک کو نفرت کی آگ نے
دل داغدار کر دیے ناحق کی لاگ نے

(انقلابِ دہر)

انھیں افسوس ہوتا تھا کہ شیخ و برہمن کی کشاکش سے دامانِ اتحاد کی دھجیاں اُڑ گئی ہیں اور شہیدوں کے خون سے جس خیابانِ اتحاد کو سینچا گیا تھا، وہ ناحق تاراج ہو رہا ہے۔ اس بات سے انھیں صدمہ پہنچتا تھا کہ لوگوں کے دل بغض اور کینے سے بھر گئے ہیں اور وہی جنھوں نے اتحاد کے پیمان باندھے تھے، اب انھیں توڑنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اپنی ایک نظم میں وہ ہندو مسلمان دونوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہند کے ہندوؤ، مسلمانو! عقل سے کام لو، کہا مانو
یہ نہ مذہب ہے، نے سیاست ہے بربریت ہے اور وحشت ہے
گھر سے نکلو، گھروں کو آگ لگاؤ بیکسوں، بےبسوں کو اس میں جلاؤ
بے گناہوں کو راہ چلتوں کو گھیر لو اور ذبح کر ڈالو
چیختی عورتوں پہ وار کرو نیزے بچّوں کے دل سے پار کرو
کیا یہی چیز آدمیت ہے؟
یہی مذہب، یہی شرافت ہے؟

(اہلِ وطن کی خدمت میں)

اِس کے بعد اُنھوں نے تنبیہ کی ہے کہ عداوت کے جس "بیج" کو بونے کی کوشش کی جا رہی ہے، وہ پھوٹ کر "آزار کا درخت" بنے گا اور اس سے بغض و کینہ کا پھل کھا کر پوری قوم کی زندگی تلخ ہو جائے گی۔ اس پیشگوئی کی صداقت سے آج شاید ہی کسی کو انکار ہو!

ہندو مسلمانوں کے اس انتہائی نفاق کے زمانے میں صرف انگریز ممبروں پر مشتمل ہندوستان میں سائمن کمیشن آیا۔ (۱۹۲۸ء) وطن دوستوں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ لیکن کچھ انگریز نواز

سیاسی جماعتوں نے اس کا استقبال بھی کیا۔ سیاسی افتراق و انتشار کے اس عالم میں محروم نے جو نظم کہی، ملک کی بدحالی اور ہندو مسلمانوں کی پھوٹ کا دل سوز نوحہ ہے:

ہے مشہور ہندوستاں کا نفاق	مرض ہو گیا ہے پُرانا نفاق
عجب لوگ ہیں اہلِ ہندوستاں	نہیں جانتے اپنا سود و زیاں
نہیں متّفق یہ کسی بات پر	تُلے رہتے ہیں اختلافات پر
نہ لیڈر یہاں کے بہم متّفق	نہ پبلک، نہ اہلِ قلم متّفق

(سائمن کمیشن)

بیسویں صدی کے رُبعِ دوم کے آغاز میں آزادی کا جذبہ عوام کے دلوں میں لاوے کی طرح اُبل رہا تھا۔ پُرامن تحریکوں کے علاوہ ملک بھر میں دہشت پسندوں کے کئی گروہ مصروفِ پیکار تھے۔ ریل کی پٹڑیاں اکھیڑی جاتی تھیں اور بم پھینکے جاتے تھے۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں بم پھینکنے پر بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی گرفتار ہوئے۔ بعد کو اُن پر سانڈرس کے قتل کا بھی مقدمہ چلا، اور سب کو پھانسی دے دی گئی۔ وطن کے ان سرفروشوں کا ذکر محروم کے ہاں کئی جگہ آیا ہے۔ بھگت سنگھ سے متعلق یہ رباعی ملاحظہ ہو:

زنداں میں شہیدوں کا وہ سردار آیا	شیدائے وطن، پیکرِ ایثار آیا
ہے دار و رسَن کی سرفرازی کا دن	سردار بھگت سنگھ سرِ دار آیا

انگریزوں کی وعدہ خلافیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔ بالآخر گاندھی اروِن پیکٹ پر اس کا خاتمہ ہوا، اور مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔ وہاں فرقہ وارانہ انتخاب کے مسئلے پر کونسل کے اراکین سے اختلاف ہوا، اور کانفرنس کامیاب نہ ہو سکی۔ انگریز جنگِ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے زمانے سے ہندوستانیوں میں باہم تفرقہ ڈال کر اُن کے استیصال کی جس

پالیسی پر چل رہے تھے، اس کا تقاضا یہی تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ پھوٹ ڈالی جائے۔ چنانچہ ان کے اتحاد کے تابوت میں آخری کیل کمیونل اوارڈ کی ٹھونکی گئی، جو ۱۹۳۲ء میں کانگریس کی شدید مخالفت کے باوجود یہاں نافذ ہو گیا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح پنجاب میں بھی وطن پرستوں نے اِس اوارڈ کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اقبال نے جب اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا، تو اسے دیوانہ پن کا نام دیا۔ محروم کا یہ شعر اسی تلخیِ دوراں کی یادگار ہے:

تلخیِ تفرقہ ہر روز بڑھی جاتی ہے
فرقہ واری کا نتیجہ نظر آتا ہے تجھے؟

کمیونل اوارڈ نے آزادی کی قریب آتی ہوئی منزل کو دور تر کر دیا اور فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے میں مدد دی۔ محروم نے ان سیاسی حالات کا تجزیہ اپنی ایک نظم میں یوں کیا ہے:

ہر فرقہ اپنی ڈفلی پہ گاتا ہے راگ اور — بھڑکی ہے اس سے فرقہ پرستی کی آگ اور
پھنکارتا ہے آج تعصب کا ناگ اور — ڈھیلی ہوئی سمندِ عداوت کی باگ اور

ہے اس کے منہ میں زہر کمیونل اوارڈ کا
ہندی ہیں اور قہر کمیونل اوارڈ کا

(کمیونل اوارڈ)

۱۹۴۲ء میں آزادی کی تحریک نہایت شدید صورت اختیار کر گئی۔ ملک بھر اور خصوصاً بنگال میں دہشت پسندوں نے انگریزی اقتدار کو زک پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس موقع پر انگریزوں کی انصاف پسندی اور رعایا پروری کی اس سے بہتر مثال کیا ہو گی کہ بنگال میں شدید ترین قحط رونما ہوا اور غریب عوام لاکھوں کی تعداد میں بن آئی موت مر گئے۔ دیدۂ عبرت نگاہ کے لیے یہ صدمہ تازیانے سے کم نہ تھا۔ محروم بھی دل کے درد کے ہاتھوں تلخ نوائی پر مجبور ہوئے، قوم کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

افکارِ محرومؔ

اے مستِ مئے بے خبری! حالِ جہاں دیکھ!
کیا اہلِ وطن کا تجھے غم کچھ بھی نہیں ہے؟
سفّاک بہت خوش ہیں تباہی پہ ہماری
بنکم کے ترانوں کا وطن نالہ کناں ہے
جس خطّے سے اٹھّی ہے صدا حُبّ وطن کی
ٹوٹا نہ اگر حلقۂ زنجیرِ غلامی

سرحدِ فنا ہے یہی، پہنچا ہے کہاں، دیکھ!
بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے؟
یہ جَور ہے ناکردہ گناہی پہ ہماری
ٹیگورؔ کے نغموں کا چمن وقفِ خزاں ہے
ملتی ہے اسے آج سزا حُبّ وطن کی
اس سے بھی خطرناک ہے تقدیرِ غلامی

(قحطِ بنگال)

محرومؔ کی قومی شاعری کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ اُنھوں نے تحریکِ آزادی کے تاریک سے تاریک لمحوں میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس نصف صدی میں ملک ایسے ایسے مشکل اور نازک مرحلوں سے گزرا کہ بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ لیکن محرومؔ کی شاعری میں کہیں نا امیدی، بیدلی یا ہراس کے آثار نظر نہیں آتے۔ اُنھوں نے یقین کی شمع کو ہمیشہ روشن رکھا اور آزادی کی امید بندھاتے ہوئے آنے والے بہتر دور کی بشارت دی ہے۔ "شعاعِ امید" میں کہتے ہیں:

جلوۂ صبح یقینی ہے شبِ تار کے بعد
دورِ اقبال ہے ہر قوم کا ادبار کے بعد
جہدِ ہستی سے نہ گھبرا کہ نمایاں ہوگا
دورۂ امن و اماں گرمیِ پیکار کے بعد

بعض نظموں میں انھوں نے نوجوانوں سے خطاب کیا ہے؛ اُنھیں طرح طرح سے اُبھارا اور للکارا ہے اور جدوجہدِ آزادی میں شامل ہونے کی دعوت دی ہے۔ "ہمّت کرو جوانو"، "بڑھے چلو" اور "فغاں کیے جاؤ" میں اُنھوں۔ واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ منزلِ قریب ہے اور وہ دن دور نہیں، جب ہم گوہرِ مراد کو پالیں گے۔ "نوجوانانِ وطن سے گزارش" میں انھوں نے تلقین کی ہے کہ جس مادرِ ہند نے تمھیں پروان چڑھایا ہے، اُس کا بھی

تم پر کچھ حق ہے اور اب ضروری ہے کہ اس کی غلامی کی زنجیریں توڑ پھینکی جائیں۔ دیکھیے، "بزمِ نو" میں کس اعتماد کا اظہار کرتے ہیں :

بھارت کے نوجوانو! اک بزمِ نو بنائیں — حُبِّ وطن کی شمعیں اُس بزم میں جلائیں
ہو بزمِ نو ہماری خجلت دہِ گلستاں — بلبل سے بڑھ کے چہکیں، گُل ہو کے کھلکھلائیں
حُبِّ وطن کی مے کا چلتا ہو دَورِ پیہم — بھر بھر کے جام و ساغر باہم پییں، پلائیں
ہستی کے مدّعا کو پورا کیا ہے ہم نے — اِس عمر میں اگر ہم بھارت کے کام آئیں

"نوجوانوں سے خطاب" کے چند شعر ملاحظہ ہوں، جن کا ایک ایک لفظ غیرتِ قومی کے لیے تازیانے کا حکم رکھتا ہے :

نوجوانانِ کشورِ پنجاب! — نونہالانِ گلشنِ شاداب!
ذلّتِ مادرِ وطن پر تم — جائے حیرت ہے، یوں رہو گم سُم
جوش آئے نہ خونِ غیرت میں — بے حسی ہو رگِ حمیّت میں
تم کو آخر یہ ہو گیا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟"

محروم کو وطن کے خادموں اور سرفروشوں سے گہری عقیدت رہی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ زبانِ شعر سے اُن کی ہمت افزائی کی ہے، اُن کے حوصلے بڑھائے ہیں اور اُن کی قربانی اور ایثار کے گیت گائے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری ایک ایسا نگارخانہ ہے جس میں ہندوستان کی تقریباً تمام محبوب قومی ہستیاں اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ ان میں بال گنگا دھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے، سی آر داس، موتی لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد جیسے قومی رہنما ہیں تو سبھاش چندر بوس، لاجپت رائے، اور حسرت موہانی جیسے سرفروش اور بھگت سنگھ اور ہری کشن جیسے شہیدانِ وطن بھی ہیں۔ ان سب سے متعلق محروم نے بیسیوں نظمیں کہی ہیں۔ کچھ مرثیے

بھی ہیں جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھے گئے ہیں اور جنھیں پڑھ کر آج بھی دل میں درد کی ٹیس اٹھتی ہے۔ یوں تو سب نظمیں ہی بڑی پُر تاثیر اور دردناک ہیں، لیکن لاجپت رائے سے متعلق نظموں میں کچھ اور ہی بات ہے۔ اُن سے وہ غالباً ذہنی طور پر عشق کرتے تھے۔ اُن کی جلاوطنی، مسافرت، گرفتاری، رہائی، علالت، صحت یابی، وفات غرضکہ ہر واقعے سے متعلق اُنھوں نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ لاجپت رائے کا نوحہ "اشکِ خوں" اس قابل ہے کہ اسے کاروانِ وطن میں پورا کا پورا پڑھا جائے۔ دوسرے مرثیوں میں گوپال کرشن گوکھلے والی نظم "چار آنسو" اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں بحر اور ردیف و قوافی کا انتخاب اور الفاظ کی نشست کچھ اس انداز کی ہے کہ وجدانی طور پر تحریکِ آزادی کے اولیں سربراہوں کے تدبّر و دانش اور وزن و وقار کی ایک جھلک سی سامنے آجاتی ہے:

مانگ رہا تھا غیب سے جس کی بقا تمام ہند	سوگ میں آج اس کے ہے بزمِ عزا تمام ہند
بخت کی نارسائی سے، چرخ کی کج ادائی سے	ہو گئی آہ نارسا، تیری دعا، تمام ہند
فخرِ زمانہ کونسا آج جہاں سے چل دیا	وقفِ الم ہے اک جہاں، محوِ بکا تمام ہند
مادرِ ہند کے سپوت تیرے غمِ فراق میں	آج ہے داغ خوردۂ سوزِ فنا تمام ہند

ہند کے جو فدائی ہوں، وہ نہ جییں، ہزار حیف!
وقت سے پہلے چل بسیں، گردشِ روزگار حیف!

محروم نے کئی نظمیں براہِ راست وطن سے متعلق بھی کہی ہیں۔ ان میں "ہندستان ہمارا"، "صبحِ وطن شامِ وطن"، "خاکِ ہند" اور "اپنا وطن" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں انھوں نے خاکِ وطن کے ہر ذرے کو دیوتا بنا کر پیش کیا ہے۔ ہندستان کے چاند تاروں کی باتیں کی ہیں، اس کے پہاڑوں، دریاؤں اور وادیوں کے حسن اور دلکشی کے ترانے گائے ہیں اور اس کے ماضی کی عظمت کی داستانیں سنائی ہیں۔ ان نظموں میں محروم کا تخیّل سرزمینِ وطن کے

چپّے چپّے پر اُڑا ہے۔ کہیں اُس نے گنگا اور جمنا کی موجوں کی تڑپ دیکھی ہے، کہیں سورج کی اِن کرنوں سے باتیں کی ہیں جو زمین کے سینے کو چوم رہی تھیں، کہیں چوپایوں کی گھنٹی کی صدا سُنی ہے، کہیں جھونپڑوں کی چھاؤں میں سکون واطمینان کی سانس لی ہے، کہیں کوئل سے دکھ درد بانٹا ہے اور کہیں کھیتوں کی نرم نرم مٹی کو ماتھے سے لگایا ہے۔ ایسی نظموں میں روانی، زورِ بیاں اور جوشِ جذبات کے اعتبار سے "خاکِ ہند" خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ اس کے آخری دو بند جو ہندُستان کی گذشتہ عظمت کے بارے میں ہیں، پیش کرتا ہوں:

تہذیب تیری چشمِ جہاں میں سما گئی　　　تعلیم تیری جور وستم کو مٹا گئی
تقلید تیری دہر کو جنّت بنا گئی　　　تا ساحلِ عرب تری ٹھنڈی ہوا گئی

ہر ذرہ ہے ترا وہ ضیا بارِ فلسفہ
یونان تلک گئے ترے انوارِ فلسفہ

تو آج مٹ مٹا کے بھی ہے فخرِ روزگار　　　بس چل سکا نہ گردشِ دوراں کا زینہار
دورِ زماں سے مٹ نہیں سکتی تری بہار　　　ہر داغِ دل ہر پھول کی صورت میں آشکار

بدخواہ گو ہے صدیوں سے چرخِ کہن ترا
پھر بھی اُجڑ اُجڑ کے ہرا ہے چمن ترا

خاص آزادی اور اس کی برکتوں پر محرومؔ نے کچھ زیادہ نہیں لکھا، لیکن غلامی کی لعنت، اس کی برائیوں اور قوموں کو تباہ کر دینے والے اثرات پر انھوں نے کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ "تصویرِ غلامی" کے عنوان سے انھوں نے ایک نہایت پُرتاثیر مثنوی لکھی ہے۔ اس میں فلسفۂ غلامی کو عام فہم اور دلچسپ انداز میں نظم کیا ہے اور آخر میں بتایا ہے کہ غلام قوم کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب کوئی مردِ مجاہد اپنے حسنِ عمل اور سوزِ یقین سے

مردہ قوم کی رگوں میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ مثنوی کے شروع میں غلامی کی مذمت کی ہے اور اس کی لعنتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بالواسطہ طور پر آزادی کی خوبیوں کا احساس دلایا ہے:

ہے مصدرِ صد گنہ غلامی ۔۔۔ جس سے ہو ذلیل ہر گرامی

افراد ہیں بے وقار اِس سے ۔۔۔ اقوام ذلیل وخوار اِس سے

شیروں کو کیا ہے اِس نے روباہ ۔۔۔ جو کوہ گراں تھے، ہو گئے کاہ

گِر جاتا ہے مرتبہ بشر کا ۔۔۔ دیتا ہے وہ کام گاؤ، خر کا

ہر بات میں دوسرے کا محتاج ۔۔۔ کیونکر رکھے اپنے نفس کی لاج

جس قوم کی مرگ وزندگانی ۔۔۔ جس قوم کا رنج وشادمانی

جس قوم کی سب برائی نیکی ۔۔۔ اور جس کا زوال اور ترقی

صدیوں سے ہو زیرِ حکمِ اغیار ۔۔۔ اُس قوم کا حال کیوں نہ ہو زار

اپنی کئی نظموں میں انھوں نے ہندستان کی غلامی کی تصویر بڑے مؤثر پیرایے میں کھینچی ہے؛ اس کے دکھ درد اور اس کی بربادی، مفلسی اور ناداری کا ماتم کیا ہے؛ اپنے ہم وطنوں کی غیرت کو اُبھارا ہے اور ان کی بے حسی، کاہلی اور غفلت شعاری پر انھیں ٹھوکے دیے ہیں۔ ایسی دو نظموں سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ ان اشعار میں مقصد کی لگن، احساس کی گہرائی اور جذبے کا والہانہ پن اتنا نمایاں ہے، کہ یہ وطن سے گہری محبت کے بغیر ممکن نہیں:

خورشید پہ داغِ دلِ سوزاں کا ہے دھوکا

یا شعلۂ آہِ شرر افشاں کا ہے دھوکا

یا شمعِ سرِ گورِ غریباں کا ہے دھوکا

یا اخگرِ سوزِ غمِ پنہاں کا ہے دھوکا

افکارِ محروم

شبنم پہ تری اشکِ چکیدہ کا گماں ہے
یہ گنبدِ نیلی ہے کہ آہوں کا دھواں ہے

(صبحِ وطن)

ہند کی تاریخ میں ہم نے پڑھا ہے بارہا
رشکِ فردوسِ بریں یہ خطۂ شاداب تھا
اس کے باشندے تھے حق بیں، رحمدل و باصفا
تھا بفیضِ قدرتِ ربِ کریم اس ملک کا
"ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا"

اُس کی حالت آہ لیکن رحم کے قابل ہے آج
ہر بلائے ناگہانی کی یہی منزل ہے آج
انقلابِ دہر سے موجِ کرم ساحل ہے آج
گفتۂ غالب کی ہے تصویر یاں جو دل ہے آج
"عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا"

(تضمین)

آخر ہندوستان کی تحریکِ آزادی کامیاب ہوئی اور جب منزل سامنے نظر آنے لگی تو محروم نے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کیا:

پیدا اُفقِ ہند سے ہیں صبح کے آثار
ہے منزلِ آخر میں غلامی کی شبِ تار
آمد سحرِ نو کی مبارک ہو وطن کو
پامالِ محن کو!
مشرق میں ضیا ریز ہوا صبح کا تارا
فرخندہ و تابندہ و جاں بخش و دل آرا

روشن ہوئے جاتے ہیں در و بام وطن کے
زندانِ کہن کے!

(بجے ہند)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعر کا وطن ہی اس کا اپنا وطن نہ رہا اور اُسے اُنھیں فضاؤں کو خیرباد کہنا پڑا، جن میں اُس وقت تک وہ سانس لے رہا تھا۔ ترکِ وطن کرتے ہوئے محروم نے "پاکستان کو الوداع" کے عنوان سے ایک نہایت دردناک نظم لکھی ہے۔ یہ ان کے مجموعے کاروانِ وطن میں شامل ہے۔ یہاں صرف ایک رباعی پیش کرتا ہوں، جو خون کے آنسو سے کم نہیں:

آج اپنے وطن سے جا رہا ہے محروم
مامن پیشِ نظر، نہ منزل معلوم
ہنگام وداع ہم نے دیکھا اس کو
حسرت زدہ، دل شکستہ، حیراں، مغموم

یہ تھی محروم کی قومی شاعری کی ایک جھلک، اسکا مقصد ان کی شاعری کے اُس پہلو کو روشنی میں لانا تھا، جس پر ابھی زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ محروم کی شاعری کے حکیمانہ اور اخلاقی لہجے سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ محض اخلاقی شاعر ہیں، حالانکہ یہ ان کے رنگِ سخن کا صرف ایک پہلو ہے۔ جیسا کہ بیان ہوا، محروم کی شاعری کا آہنگ انفرادیت کا نہیں اجتماعیت کا ساتھ دیتا ہے۔ ان کے نزدیک اخلاقی قدروں کا فروغ ہی سب کچھ نہیں، آزادی کا حصول اور اس کے استحکام کی تمنا بھی برابر کی اہمیت رکھتی ہے۔ بنیادی انسانی قدریں دراصل ذریعہ ہیں ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کا۔ ہندوستان میں ہم انسانی ترقی سے الگ ہو کر مادی خوشحالی کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ بہتر زندگی اور بہتر مستقبل کی بنیاد اعلیٰ انسانی قدروں ہی پر رکھی جاتی ہے۔ غلامی اِن سب کی نفی ہے۔ اِس کے برعکس آزادی ان کے پنپنے کے لیے صحیح فضا مہیا کرتی ہے، اور ان کے فروغ و بقا میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ محروم کی شاعری میں وطن سے محبت اور آزادی کی تمنا کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ یہی وہ نکتہ ہے، جس کی مدد سے محروم کی آواز کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے اور ان کے دل کے راز تک رسائی ہو سکتی ہے۔

محروم: بچّوں کے شاعر

از

خلیق انجم

ایم اے، پی ایچ ڈی

کروڑی مل کالج، دلّی

خلیق انجم

محروم: بچّوں کے شاعر

بچّوں کے اردو ادب میں حکیم یوسفی کے قصیدہ در لغاتِ ہندی، ضیاء الدین خسرو کی خالق باری، تجلّی کی اللہ خدائی، میر عبدالواسع کی حمدِ باری سے لیکر اسداللہ خاں غالب کے قادرنامہ تک بہت سی کتابوں کے نام مل جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام کتابوں کی حیثیت نصابی ہے اور یہ بچّوں کو فارسی اردو مرادفات یاد کرانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ قدیم ادب میں میرامّن اور نظیر اکبر آبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ باغ و بہار بڑوں کے لیے لکھی گئی تھی، لیکن سادگیِ بیان اور درویشوں کے کارناموں نے اس کے بعض حصّوں کو ایسا بنا دیا تھا کہ بچے بھی اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی نے بھی غیر شعوری طور پر بچوں کے ادب میں اضافہ کیا۔ اُن کی نظمیں "ریچھ کا بچہ" اور "ہنس" مدتوں نصاب میں داخل رہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی تہذیب اور ادب پر مغرب کے اثرات بتدریج گہرے ہونا شروع ہوئے؛ پھر محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کی کوششوں سے جدید نظم کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی عہد میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو اس بات کا بھی احساس ہوا کہ تعلیم پانے والے بچّوں کو بھی ادب کی اتنی ہی ضرورت ہے، جتنی کہ تعلیم یافتہ بالغوں کو؛ اور جس طرح بڑوں کی اپنی پسند یا ناپسند ہوتی ہے، اُسی طرح بچّے بھی اچھے اور بُرے میں تمیز کرتے ہیں، بچّے بھی سوچنے والا دماغ رکھتے ہیں۔ خالق باری قسم کی کتابیں ڈنڈے کے زور سے پڑھائی تو جاسکتی ہیں، اور پوری کتاب کو رٹوایا

بھی جا سکتا ہے، لیکن یہ کتابیں بچّوں میں مطالعے کا شوق پیدا نہیں کر سکتیں، بچّے ان کتابوں کو جماعت میں تو پڑھ لیں گے، لیکن فرصت کے اوقات میں اُنھیں ہرگز نہیں پڑھیں گے۔ قدیم طرز کے نصاب لکھنے والوں میں شاید غالبؔ پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے شعوری کوشش کی ہے کہ ان کی نظم قادر نامہ اتنی بے کیف اور سپاٹ نہ رہے کہ بچّے اس میں بالکل دلچسپی ہی نہ لیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے قادر نامہ میں غزل کے کچھ اشعار بھی شامل کر دیے ہیں۔ اور اُن کی زبان، نفسِ مضمون اور اسلوبِ بیان ایسے رکھے ہیں جو بچّوں کے شوق اور اُن کی نفسیات کے قریب ہیں تاکہ ان میں دلچسپی پیدا ہو۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے:

وہ چُرا دے باغ میں میوہ، جسے
پھاند جانا، یاد ہو، دیوار کا
پُل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ
ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا
واہ بے لڑکے، پڑھی اچھی غزل
شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا!

میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، لیکن میرا خیال ہے کہ غالبؔ سے پہلے کسی شاعر نے بچّوں کے لیے اس انداز کے شعر نہیں کہے۔ اگر یہ ٹھیک ہے، تو ماننا پڑیگا کہ بچّوں کے جدید ادب کی ابتدا بھی غالبؔ سے ہوتی ہے۔

آزادؔ، حالیؔ اور ڈپٹی نذیر احمد اردو کے وہ پہلے شاعر اور ادیب ہیں، جنھوں نے مغرب سے متاثر ہو کر بچّوں کے ادب سے متعلق سنجیدگی اور باقاعدگی سے غور کیا؛ اور بچّوں کی نفسیات کے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس میں نذیر احمد کو کامیابی نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنا ناول مراۃ العروس حالانکہ بچیوں کی تعلیم کے لیے لکھا تھا، لیکن

اردو ادب نے ابتدا ہی سے اسے بڑوں کے ادب میں جگہ دی۔ حالی اور آزاد نے اپنے عہد کے مطابق البتہ کارِ نمایاں کیا۔ ان دونوں نے بچوں کے لیے قابلِ قدر اور بلند پایہ نظمیں لکھیں۔ نثر میں آزاد کی نصیحت کا کرن پھول اور قصصِ ہند جیسی اہم تصنیفات ہیں۔

ان کے بعد اسمٰعیل میرٹھی کا زمانہ آتا ہے۔ انھوں نے اپنے پیشرو ادیبوں اور شاعروں کے مقابلے میں بچوں کے ادب میں کہیں زیادہ اضافہ کیا۔ ان کی نظمیں آج تک نصاب میں داخل ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی کے بعد تلوک چند محروم کا نام آتا ہے۔ محروم نے جہاں اردو نظم اور غزل میں بیش بہا کارنامے سرانجام دیے، وہیں شعوری طور پر ایسا ادب بھی پیدا کیا، جسے بچوں کے ادب کی کوئی تاریخ نظر انداز نہیں کرسکتی۔ محروم کی ساری زندگی درس و تدریس میں گزری، اس لیے بچوں کی نفسیات پر ان کی بہت گہری نظر ہے۔ جس کا ثبوت ان کی وہ نظمیں ہیں، جو بہارِ طفلی میں شامل ہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ محض سیدھی سادی روزمرہ کی زبان میں کوئی دلچسپ قصہ لکھ دینے سے بچوں کے ادب کی ضروریات پوری ہوجاتی ہیں۔ یہ خیال ٹھیک نہیں ہے۔ ایسے ادب کا ایک مقصد ہے، اور اس کی مخصوص افادیت ہوتی ہے۔ یوں تو جن اور پری کے قصے بھی بچوں کی تخئیل کی کھڑکیاں کھول کر انھیں ایک نئی دنیا میں لے جانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن یہاں اصلی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قصہ بچے کے ذہنی نشو ونما کے لیے ضروری بھی ہے؟ کیا یہ بچے میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کا فہم و ادراک پیدا کرتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا یہ قصہ بچے کے ذہن نشین کراتا ہے کہ انسان کو انسان کی مدد کرنی چاہیے؛ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے؛ محنت سے جی نہیں چرانا چاہیے؛ حسد نہیں کرنا چاہیے؛ ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے وغیرہ۔ اگر کسی قصے سے بچے کے ذہن پر یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں، تو وہ خواہ کتنا ہی ما فوق الفطرت کیوں نہ ہو، ہم اسے بچوں کے ادب کا کامیاب نمونہ کہینگے۔ اس کے برعکس وہ ادب ناکام ہے، جس میں اخلاقی اور مذہبی نصیحتیں بغیر کسی تائیدی قصے

یا دلچسپ اندازِ بیان کے پیش کردی جاتی ہیں۔ کڑوی دوا بچّے تو کیا، بڑوں کو بھی گوارا نہیں ہوتی! اندازِ بیان کو دلچسپ بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جو کچھ کہنا ہو، اسے منظوم کر دیا جائے۔ اگر صاف اور سیدھی بات نثر میں کہی جائے، تو اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ جو لوگ محنت کر کے پڑھتے ہیں، انھیں کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ تو بچّے کے ذہن پر ایسی سیدھی سی بات کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوگا، لیکن اس کے مقابلے میں اگر اسی بات کو ہم محرومؔ صاحب کے الفاظ میں اس طرح پیش کریں:

پڑھو اور محنت سے تم نام کرلو
بڑھے جس سے عزّت، وہی کام کرلو

تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ شعر اور اس شعر کے ذریعے سے یہ بات بچّے کے دل اور دماغ میں نہ اُتر جائے۔ محرومؔ کے بے شمار اشعار جو ہم نے بچپن میں اپنے نصاب میں پڑھے تھے، آج تک ذہن پر نقش ہیں۔ محرومؔ صاحب نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ جن میں سے کچھ بہارِ طفلی کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ اس مجموعہ کی ابتدا ایک نظم دعا سے ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میں بعض مشکل الفاظ آ گئے ہیں۔ لیکن کتاب کے آخر میں فرہنگ دے کر بچّوں کی یہ مشکل حل کر دی گئی ہے۔ محرومؔ صاحب بہت بڑے خدا پرست تھے۔ اُن کی تمنّا تھی کہ بچّے دنیا میں کچھ اور سیکھنے سے پہلے اُس ذات کو پہچانیں جو ان کی خالق ہے۔ نظم کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

ہر چیز سے عیاں ہے یارب، ظہور تیرا
خورشید میں، قمر میں، تاروں میں نور تیرا

بچہ خدا کی عظمت کے گیت گاتا ہے:

قدرت سے تیری ساکن، قدرت سے تیری جاری
قائم ترے سہارے، ہے کائنات ساری

اسی طرح کئی اشعار میں خدا کی تعریف کے بعد بچّہ خود کو خدا کے حضور میں پیش کرتا ہے :

حاضر ہیں تیرے در پر پروردگار ہم بھی
ہیں رحم اور کرم کے امّیدوار ہم بھی
علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھا دے
جس سے ملے سعادت، اُس راہ پر چلا دے
یارب، تری رضا کے طالب رہیں ہمیشہ
نیکی کریں، بدی پر غالب رہیں ہمیشہ
عقبیٰ کی سرخروئی، دنیا کی کامگاری
حاصل ترے کرم سے ہو ہم کو، ذاتِ باری!

اپنی نظم "خدا کا شکر" میں شاعر کائنات کی مختلف چیزوں کا ذکر اس طرح سے کرتا ہے کہ بچّے کی پوری توجہ دنیا کے رنگارنگ مظاہر کی طرف مبذول رہتی ہے۔ اس نظم میں بچوں کی معصومیّت، بھولپن اور سادگی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی بڑوں کی فکر کی گہرائی اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش بھی۔ بچّوں کو اپنی ذات، اپنے ماں باپ، اور بھائی بہن سے جو لگاؤ ہوتا ہے، اسے بھی مدِّنظر رکھا گیا ہے۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

محبّت سے دل کو کیا شاد میرے
دیا سر پہ ماں باپ کا تو نے سایا
دیے مجھ کو بھائی بہن پیارے پیارے
محبّت کا ہر سمت دریا بہایا
کرم سے ترے کھیتیاں لہلہائیں
نمی اور حرارت نے اُن کو پکایا
سمندر، جزیرے، پہاڑ اور دریا

جو منظر دکھایا، سو دلکش دکھایا
ستاروں کو جگمگ سرِ آسماں دی
تو پھولوں کو فرشِ زمیں پر کھلایا

بچّوں کے کسی ادیب اور شاعر کا ایک اہم فرض یہ ہے کہ وہ بچوں کو محنت اور کام کی ترغیب دے۔ مخدوم صاحب اپنے اس فرض سے غافل نہیں رہتے۔ انھیں جب بھی موقع ملتا ہے، محنت اور کام کا ذکر ایسے الفاظ اور اس انداز سے کرتے ہیں کہ یہ بچّوں کے ذہن پر بار نہیں ہو سکتا۔ مثلاً سالِ نو پر بچّوں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہتے ہیں:

مبارک اے عزیزانِ وطن، ہو سالِ نو تم کو
تمھارے واسطے یہ سال فرخ فال ہو جائے
جو کرنا ہے، کرو پکّے ارادے باندھ کر دل میں
کہ حسرت رہ نہ جائے، ختم جب یہ سال ہو جائے

اسی موضوع پر دوسری نظم میں یہی بات بہت ہی دلکش الفاظ میں کہی ہے:

طبیعت میں پیدا نئی تازگی ہو
نئے تم، نیا دل، نئی زندگی ہو
امیدیں نئی دل کو پھر گدگدائیں
امنگیں نئی پھر نیا رنگ لائیں

یہاں سے نظم ایک ہلکا سا موڑ لیتی ہے اور مخدوم اصل بات پر آ جاتے ہیں:

نئے سر سے میدانِ ہمت میں آؤ
نئے قابلیت کے جوہر دکھاؤ
پڑھو اور محنت سے تم نام کر لو
بڑھے جس سے عزت، وہی کام کر لو

کام اور محنت کے موضوع پر مستقل نظمیں بھی ہیں۔ کام میں بچوں کی سطح پر آکر ان کی زبان اور ان ہی کے لب و لہجے میں کام کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک اور نظم "اچھے کام" میں بتایا ہے کہ خدائے لایزال کے حکم سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے کام میں مصروف ہے۔ انسان تو کیا، بے جان اشیا کو بھی کام سے مفر نہیں ہے:

فارغ جہاں میں کوئی نہیں کام کاج سے
مجبور ہے ہر ایک جہاں کے رواج سے
خورشید، ماہ و انجمِ تاباں ہیں کام میں
مصروف ہیں کسی نہ کسی انصرام میں
ہیں ابر و برق و باد بھی مامور کام پر
شاہد ہیں ان کی کارگزاری کے بحر و بر

یہاں تک محروم صاحب نے یہ بتایا ہے کہ خورشید ہو یا انجمِ تاباں، ابر ہو یا برق، ہر شے اپنے کام میں مصروف ہے۔ یہاں سے گریز کرتے ہیں:

قدرت سے آدمی نے سبق کام کا لیا
لیکن پھر اس میں خود غرضی کو ملا لیا
دنیا اسی سے دارِ مصیبت ہوئی کہ ہم
کرتے ہیں فیضِ عام کے دنیا میں کام کم
پابند یوں تو سب ہیں زمانے میں کام کے
اچھے وہی ہیں کام جو ہیں فیضِ عام کے

اسی طرح نظم "محنت" میں طرح طرح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کا معمولی سے معمولی کام بھی محنت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس میں مثالیں بچوں کے اپنے ماحول سے دی گئی ہیں:

محنت بغیر جینا ممکن نہیں جہاں میں
محنت سے وہ بنا ہے رہتے ہو جس مکاں میں
محنت کا پھل ہیں پودے جتنے ہیں گلستاں میں
محنت لگی ہوئی ہے بلبل کے آشیاں میں

محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

محنت نہ گر برس دن کرتا کساں بچارا
پیدا نہ ہوتا غلّہ، ہوتا نہ گھاس چارا
محتاج روٹیوں کو پھرتا جہان سارا
ہر شخص کو جہاں میں محنت کا ہے سہارا

محنت کرو عزیزو! محنت سے کام ہوگا

بڑوں کے معیاری ادب سے بچّے اس لیے لطف اندوز نہیں ہوسکتے کہ ان کے تجربات بڑوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں فہم وادراک کی صلاحیتیں بھی کم ہوتی ہیں۔ بچّوں کے الفاظ کا ذخیرہ بھی محدود ہوتا ہے۔ لیکن بچّوں کا وہ ادب ہرگز معیاری نہیں کہلا سکتا، جس سے بچے تو لطف اٹھائیں، لیکن بڑوں کے لیے اُس میں کوئی دلچسپی کا سامان نہ ہو۔ محرّوم صاحب کی ان تمام نظموں کی خوبی یہ ہے کہ وہ بچّوں کے لیے لکھی گئی ہیں، لیکن بڑے بھی ان سے برابر لطف اٹھاتے ہیں۔ یہاں میں محرّوم کی ایک نظم "کتاب" کا خاص طور پر ذکر کروں گا۔ اگر یہ بڑوں کے لیے لکھی گئی ہوتی، جب بھی کتاب کی اس سے زیادہ خوبیاں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس نظم میں شاعر نے بچّوں کی نفسیات کا پورا پورا خیال رکھا ہے، اور ایسی چیزوں کا ذکر خاص طور پر کیا ہے، جن سے بچوں کی دلچسپی قائم رہ سکتی ہے۔ الفاظ کا انتخاب بھی اسی ضرورت کے پیشِ نظر بہت احتیاط سے کیا گیا ہے۔ نظم خاصی طویل ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

بہتر کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے
اچھا کوئی شفیق نہیں ہے کتاب سے
دنیا کے دوستوں کی محبت سدا نہیں
اس سے مگر جدائی کا کھٹکا ذرا نہیں
ہم راز ہے یہ، راز چھپاتی نہیں کبھی
اور جھوٹ موٹ بات بناتی نہیں کبھی
گرچہ نہیں ہے اس کے دہن میں زباں کوئی
اس سا نہیں جہان میں شیریں بیاں کوئی
دیکھا ہے سب کتاب میں، جو کچھ جہاں میں ہے
موجود ہے زمین پہ، یا آسماں میں ہے

اس کے بعد دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں، سمندروں وغیرہ کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ مطالعے کی افادیت بچّے کے ذہن نشین ہوتی چلی جاتی ہے؛ اور اس سے اگر بچّے کو کتاب سے محبت نہیں، تو کم از کم اُس کی اہمیت کا ضرور احساس ہو جاتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ بعض لوگوں کو دوسروں کو جسمانی اور ذہنی تکلیف دینے میں خاص لطف آتا ہے۔ علمائے نفسیات نے اس مسئلے میں بہت وسیع تحقیقات کی ہے اور انھوں نے مطالعے کے بعد دو طبقوں کا پتا چلایا ہے۔ ایک وہ جنھیں دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوشی محسوس ہوتی ہے، دوسرا وہ جو خود اذیت سہہ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیتیں بچپن ہی میں نمودار ہو جاتی ہیں اور عمر کے ساتھ ان میں پختگی اور شدت آتی جاتی ہے۔ اگر ابتدا ہی میں بچّے کا رجحان دیکھ کر اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، تو وہ بڑا ہو کر ان دونوں حالتوں سے بری ہوگا اور اپنی زندگی نارمل انسان کی طرح بسر کر سکیگا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اگر بچّے کو براہِ راست نصیحت کی جائے، تو یہ کارگر نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے دل پر تکلیف

پہنچانے کا جذبہ زیادہ حاوی ہوتا ہے۔ محرومؔ نے "جیسی کرنی ویسی بھرنی" نظم میں ایک چھوٹی سی کہانی بیان کی ہے۔ کہانی کا پلاٹ مکمّل نہیں۔ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ وہ افسانہ نہیں بلکہ نظم لکھ رہے تھے۔ لیکن پوری نظم بہت مؤثّر ہے۔ "چھٹی" کا گھنٹہ بجنے کے بعد کچھ لڑکیاں گھر واپس جا رہی تھیں۔ انھیں راہ میں ایک اندھی بڑھیا ملی جو راستے سے بھٹک گئی تھی۔ ان لڑکیوں میں ایک بلا کی شریر لڑکی تھی۔ اس لڑکی کو

یہ سوجھی اپنے لچّھن اب دکھائے
ہنسے، ہمجولیوں کو بھی ہنسائے
گئی، اور جاتے ہی بڑھیا کی لکڑی
ہنسی کو ضبط کر کے اُس نے پکڑی
اسے لے کر چلی وہ اک طرف کو
شرارت تم ذرا لڑکی کی دیکھو
گڑھے میں جا کے بڑھیا کو گرایا
گری بڑھیا تو شور اس نے مچایا

یہ لڑکی جب گھر پہنچی۔ تو ماں کو پہلے ہی اس واقعے کی اطلاع پہنچ چکی تھی اس نے بیٹی کو مارا پیٹا، اور سزا کے طور پر رات کو اسے کھانا بھی نہیں دیا۔ جب لڑکی سو گئی، تو اس نے خواب میں دیکھا:

یونہی جب روتے روتے سو گئی وہ
تو کیا دیکھا کہ بوڑھی ہو گئی وہ
سفیدی آ گئی بالوں پہ اُس کے
سیاہی چھا گئی گالوں پہ اُس کے
کمر کُبڑی ہوئی اُس کی سراسر

کھڑی ہے ہاتھ ٹیکے وہ عصا پر
دہن سے گر چکے ہیں دانت سارے
ہوئے ہیں اُس کے جبڑے کُند سارے

پھر لڑکی نے خواب میں دیکھا کہ اُس کی بینائی بھی ختم ہو گئی، وہ ایک راستے پر بھٹک رہی ہے، اور کوئی راستہ بتانے والا نہیں ہے۔ اچانک ایک شریر لڑکی آ ئی اور اُس نے بڑھیا کو راستہ بتانے کے بہانے ایک گڑھے میں گرا دیا۔ اس پر لڑکی سوتے میں پلنگ سے گر گئی، جس سے اس کے ماتھے پر چوٹ آئی۔ اب آنکھ کھلنے پر اس نے خدا سے توبہ کی کہ اب کسی کو نہیں ستائے گی۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، محروم صاحب کی ساری زندگی پڑھنے پڑھانے میں گذری۔ اس لیے وہ بچّوں کی نفسیات کی تمام گرہوں سے واقف ہیں۔ انھیں اس کا اچھی طرح علم ہے کہ ان کی ذہنی تربیت اور ساخت و پرداخت میں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ "خدا"، "کام"، "محنت"، "کتاب" وغیرہ سے لے کر "بزرگوں کا ادب"، "بدزبانی سے پرہیز کرو"، "صفائی"، "دشمنی"، "ہم ہرگز جھوٹ نہ بولیں گے"، اور "سویرے اٹھنا" جیسے موضوعات کے متعلق اُن کی دلکش اور سبق آموز نظمیں موجود ہیں۔

محروم: میرے والد

از

جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد

محروم — میرے والد

یکم جولائی ۱۸۸۷ء والدِ مرحوم کی تاریخ پیدائش ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے میانوالی کے ضلع میں گاجراں والا نام کا ایک گاؤں ان کی جنم بھومی ہے۔ یہ گاؤں اسی زمانے میں دریابُرد ہو گیا تھا۔ ہمارا خاندان اپنی تھوڑی بہت کاشتکاری اور معمولی دوکان داری کو چھوڑ کر عیسیٰ خیل آ گیا اور وہیں آباد ہو گیا۔ والد کی عمر اس وقت یہی پانچ سات سال کی ہوگی۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میرا بچپن دیہاتی مسلمان بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گزرا، دریائے سندھ کی ایک شاخ گاؤں کے پاس سے گزرتی تھی۔ موسمِ گرما میں عموماً سارا سارا دن اس دریا میں نہانے اور تیرنے میں گزر جاتا تھا۔ ساون بھادوں کی برسات میں جب سارا گاؤں زیرِ آب ہو جاتا تو تمام مکان (کچے کوٹھے اور چھپّر) گر جاتے۔ اہلِ دہ کے لیے یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ لیکن چونکہ سب اس کے عادی ہو چکے تھے، کسی نہ کسی طرح گزارا کر ہی لیتے ـــــ ہم بچّوں کے لیے تو پانی کا اس طرح موجیں مارتے ہوئے گھروں کے اندر گھُس آنا باعثِ تفریح بن جاتا۔ گرے ہوئے ملبے سے کواڑوں کے تختے لے کر ان کی کشتیاں بنا لینا اور انھیں اِدھر اُدھر کھیتے رہنا اُن ایام میں ہمارا بہترین مشغلہ ہوتا تھا۔ اب جو غالب کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو وہ سماں آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے:

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

والد کا دریائے سندھ سے دلی ربط اُن کی گفتار اور اشعار میں آخر تک موجود رہا،

اور انھوں نے متعدد نظموں میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔

ان کی باقاعدہ تعلیم کوئی چھ سات برس کی عمر میں شروع ہوئی، جس کے لیے ورنیکلر فائینل مڈل اسکول عیسیٰ خیل میں داخلہ لیا اور پرائمری سے ہائی اسکول تک ہر جماعت میں اول رہے۔ پانچویں اور آٹھویں جماعت کے امتحان میں سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ اس زمانے میں ضلع بھر میں کوئی ہائی اسکول نہ تھا۔ اس لیے مزید تعلیم کے لیے ساٹھ ستر میل دور بنّوں جاکر وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوئے یہاں سے ۱۹۰۷ء میں میٹریکولیشن کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا۔ الیف، اے اور بی، اے کے امتحان بعد کو ملازمت کے دوران میں پاس کیے۔

میٹریکولیشن کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں آئے۔ راستے میں پہلی بار ملکۂ نور جہاں کا مقبرہ دیکھا۔ ان کی مشہور نظم "نور جہاں کا مزار" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ فرماتے تھے کہ اب تو مقبرے کے چاروں طرف بیلیں چڑھی ہوئی ہیں اور ویرانی کا وہ عالم نہیں، لیکن اس زمانے میں جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا ہے اس مقبرے کی کیفیت واقعی یہی تھی کہ ؎

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر
آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں میں شپرہ
اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر

معمور ہے یوں گورِ غریبانہ کسی کی
آباد رہے محفلِ جانانہ کسی کی

اسی سال میرے دادا ابا کا انتقال ہوا۔ وہ فقیر طبع انسان تھے؛ ہر آتے جاتے مسافر کی خدمت خوشی سے کرتے، اور کہیں کوئی سادھو سنیاسی مل جاتا تو اس کے ساتھ ہو لیتے، اور کئی کئی دن تک گھر سے غائب رہتے، چھوٹے دادا کو اُردو فارسی سے اچھی خاصی واقفیت تھی، اوائلِ عمر میں انھوں نے شعر کہنے کی بھی کوشش کی، لیکن یہ شوق جاری نہ رکھ سکے۔

والد کی پہلی شادی ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ پانچ برس بعد بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس کی یادگار ایک سال کی بچّی رہ گئی ۔۔ ودیا ۔۔ میری بہن، جس کی خودکشی نے والد کی زندگی سے مسرت ہمیشہ کے لیے چھین لی۔

سال بھر بعد دوسری شادی ہوئی۔ یہ اب میں اپنی والدہ کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں دو برس بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوا۔ تین چار برس کی عمر سے بعد کے واقعات میری یادوں کے دھندلکے میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ گویا اب جو کچھ کہوں گا اس میں صرف شنیدہ ہی نہیں، کچھ دیدہ بھی شامل ہے۔

عیسٰی خیل (مغربی) پنجاب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے، ہمارا وطن ہے، اس لیے محبوب ہے، ورنہ زندگی کی آسانیاں اور سہولتیں اس شہر میں قطعاً مفقود ہیں، اور تو اور زندگی کی اوّلین ضرورت پانی تک یہاں کمیاب بلکہ نایاب ہے، اب نہ جانے کیا کیفیت ہے میں اپنے وقت کی بات بتا رہا ہوں۔ شہر سے دور ایک چھوٹا سا نالہ بہتا تھا۔ شہر کی عورتیں صبح و شام سروں پر دو دو گھڑے رکھ کر پانی بھرنے کو جایا کرتی تھیں اور گھر کی ضروریات کے مطابق دن میں کئی کئی بار جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ عورت گھر میں مقید تھی۔ پانی لانے کے سوائے باہر کا سارا کام کاج مردوں کے سپرد تھا اور گھر کے اندر کا عورتوں کے۔ یہ پانی اس قابل نہیں تھا کہ پیا جا سکے لیکن مجبوراً سارا شہر اسی کو پیتا تھا۔ والد پندرہ برس کی عمر میں عیسٰی خیل سے نکلے اور بنوں، لاہور اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں چودہ برس گزارنے کے بعد یہاں واپس آئے تو اس پانی سے بیزار ہو گئے۔ انھیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ یہ پانی ہم لوگوں کو بیمار کر دے گا۔ چنانچہ وہ اکثر پانی کے گھڑوں اور صراحیوں میں پھٹکری کی ڈلی پھیرا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کو خاص ہدایت تھی کہ پانی گلاس میں اس طرح انڈیلیں کہ تہ کے قریب کے پانی میں حرکت پیدا نہ ہو۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود والد بیمار ہو گئے اور اُن کے گُردے میں پتھری پیدا ہو گئی۔ ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اسی شدّتِ درد کے

ناقابلِ بیان عالم میں انھیں چارپائی پر ڈال کر بنوں لے گئے۔ یہاں وہ مدتوں زیرِ علاج رہے۔ جب تندرستی کے بعد وہ واپس گھر لوٹے تو اب ہر لمحہ عیسیٰ خیل کو چھوڑنے کی تجویزیں پیشِ نظر تھیں لیکن اس کی کیا صورت کی جائے۔

مفتی احمد سعید میانوالی ضلع اسکولوں کے انسپکٹر تھے۔ گجرات ان کا وطن تھا۔ نیک خصلت اور تعصب سے بالا انسان۔ ذوقِ سخن بھی رکھتے تھے۔ والد کے مداح اور قدر دان تھے۔ والد نے اپنی مشکل کا ان سے ذکر کیا اور کہا کہ کسی طرح مجھے اس شہر سے نکالیے، ورنہ میں پھر بیمار پڑ جاؤں گا۔ مفتی صاحب نے ان کا تبادلہ کلور کوٹ کے مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کر دیا۔

کلور کوٹ دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کے اردگرد میلوں تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ آندھیاں یہاں بکثرت آتی ہیں۔ بارش کی صورت کو لوگ ترستے ہیں بادل اٹھتے ہیں لیکن ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ نعمتِ غیر مترقبہ۔ صاف ستھرا پانی۔ جس کی تلاش میں والد نے اپنا وطن چھوڑا تھا۔ یہاں بافراط موجود تھا۔ یہاں پہنچ کر انھیں یقین ہو گیا کہ اب کم از کم پانی کی خرابی کی بنا پر بیمار پڑنے کا اندیشہ نہیں۔

لیکن اس اسکول کی ہیڈ ماسٹری کانٹوں کا بستر نکلی۔ ٹیچروں میں شاید ہی دس جماعتوں سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی ہو۔ ان کی ذہنیت وہی تھی جو اکثر دیہاتی مدرسوں کی ہوتی ہے۔ ایک صاحب نے ایک دن اپنے طلبہ سے کہا کہ کل سب لڑکے اپنے اپنے گھر سے ایک ایک اکنی لے کر آئیں؛ مجموعی رقم سے کلاس روم کے لیے جھاڑن خریدا جائے گا۔ والد صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھیں ضابطے اور اخلاق کے پیشِ نظر یہ بہت ناگوار گزری۔ انھوں نے ان صاحب کو بلا کر کہا کہ یہ حرکت تمھارے لیے اور سارے اسکول کے لیے بدنامی کا باعث ہے۔ جب سرکاری طور پر کلاس روم کے لیے جھاڑن مہیا کیے جاتے ہیں تو خلافِ قاعدہ طلبہ سے پیسے جمع کرنے کے کیا معنی؟ وہ صاحب اس وقت تو کچھ نہ بولے لیکن انھوں نے دوسرے ٹیچروں سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہیڈ ماسٹر متعصب ہے اور مسلمانوں کو تنگ

کرتا ہے۔ کلورکوٹ میں آبادی ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان شہر سے دور اردگرد کے دیہات
میں آباد تھے۔ ان میں رئیس اور جاگیردار قسم کے لوگ بھی تھے، خوش حال اور کھاتے پیتے
بھی اور وہ بھی جو مفلس کہے جاسکتے ہیں۔ سارے علاقے میں اسکول صرف کلورکوٹ میں
تھا۔ ان دیہات کے مسلمان طلبہ کے لیے کلورکوٹ میں آکر تعلیم حاصل کرنا ایک بڑا
مسئلہ تھا۔ اس لیے اسکول میں مسلمان طلبہ کی تعداد دو چار فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ والد نے
ان دیہاتی طلبہ کی سہولت کے لیے ایک بورڈنگ ہاؤس کا انتظام کر دیا، جس سے بے شمار
مسلمان لڑکے دیہات سے آکر اسکول میں داخل ہو گئے۔ اس بات سے ان دیہات کے مسلمان
امیر غریب سب خوش ہوئے، کیونکہ اب ان کے بچوں کی مستقل تعلیم کی ایک صورت پیدا
ہو گئی تھی لیکن اسکول کے مدرّسوں کی ذہنیت جو تھی وہی رہی۔ ایک مدرّس نے بورڈنگ
ہاؤس سے دو چار پائیاں چرالیں اور جب اس سے جواب طلب کیا گیا تو اس نے والد
کو متعصب ہندو کہنا شروع کر دیا۔ مدرّسوں کی عادت تھی کہ لڑکوں سے اپنے گھروں
پر نجی کام بھی کروایا کرتے تھے۔ والد نے اس کا بھی سدِّباب کرنا چاہا۔ یہ بھی قدرتاً انھیں
ناگوار ہوا۔ غرض اور توان سے کچھ بن نہ آئی، انھوں نے والد کے خلاف ایک محاذ قائم
کر دیا۔ ضلع انسپکٹر اور ڈپٹی کمشنر کو گمنام خطوط لکھے۔ ضلع انسپکٹر مفتی احمد سعید تو
ایک شریف اور غیر متعصب انسان تھے؛ ان پر ان شکایتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور
سازشیوں کو ہر بار منہ کی کھانا پڑی، لیکن ان کا تبادلہ ہوتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔
نئے انسپکٹر صاحب مزاج کے افسر تھے، انھوں نے ان شکایات کا اثر لیا اور والد کے
خلاف تحقیقات کا حکم جاری کر دیا۔ عجیب ستم ظریفی تھی کہ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے والد نے اتنا کچھ
کیا اور تحقیقات اس الزام کی ہو رہی تھی کہ یہ شخص متعصب ہے اور مسلمان طلبہ اور مدرّسوں کو پریشان کرتا ہے۔

بجرمِ عشق توام می کشند و غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست

انھوں نے مفتی احمد سعید کو ایک خط میں لکھا ہے

فرداودی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

لیکن اب وہ دوسرے ضلع میں افسر تھے اور یہاں کے معاملات میں بے بس تھے۔ پوچھ گچھ کے لیے انسپکٹر صاحب خود تشریف لائے۔ ڈاک بنگلے میں عدالت قائم ہوئی۔ شہر کے ہندوؤں کو تو گواہی کے لیے بلایا نہ گیا تھا۔ دیہات کے مسلمان اور اسکول کے مدرّس اور طلبہ البتہ موجود تھے۔ ہر شخص کی عزّت و آبرو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یہ مدرّس دو چار بھولے بھالے طلبہ کو ورغلانے میں تو کامیاب ہو گئے، لیکن دیہات سے آئے ہوئے تمام مسلمانوں اور ذمہ دار مسلمان طلبہ نے ان سازشی مدرسوں کے خلاف گواہی دی۔ اور انسپکٹر کو اس بات پر مجبور کیا کہ والد کا کلورکوٹ سے ہرگز تبادلہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ انھیں اندیشہ تھا کہ ان کے جانے کے بعد مسلمان بچوں کی تعلیم کا وہ انتظام شاید جاری نہ رہ سکیگا۔ حق کی اور والد کی یہ عظیم فتح تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اس ماحول سے دل برداشتہ ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کانگریس کی تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ ان ایام میں والد نے قومی اور ملکی موضوعات پر بے شمار نظمیں کہیں اور یہ بغیر نام کے مختلف اخباروں میں چھپیں؛ اگر نام سے چھپتیں تو نوکری کے ماتھے جاتی۔ وہ نظم کے ساتھ ایڈیٹر کو لکھ دیتے کہ نظم بغیر نام کے یا کسی فرضی نام سے چھاپ دی جائے۔ نہ جانے یہ بات کیوں ان کے ذہن میں نہ آئی کہ اخبارات کی ڈاک سنسر بھی ہو سکتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ڈاک ہر روز سنسر ہو رہی تھی۔ والد کے خطوں کی نقلیں باقاعدہ میانوالی کی خفیہ پولیس کو پہنچ رہی تھیں اور وہاں ان کے بارے میں فائل تیار ہو رہی تھی۔ لالہ لاجپت رائے کے انتقال (۱۹۲۹ء) کے موقع پر انھوں نے ایک طویل نظم کہی۔ یہ نظم لاہور کے ایک ناشر نے کتابچے کی صورت میں شائع کی تھی۔ والد کا نام اس نظم پر موجود تھا۔ اس نظم نے گویا پولیس کی فائل "مکمل" کر دی۔ اور اب ایک اور تحقیقات

کی بنیاد پڑی۔ اب کے معاملہ ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ ان کا نام رادھا کرشن تھا۔ انھیں رائے بہادر کا خطاب بھی ملا تھا۔ اس مرتبہ والد کے خلاف کسی قسم کے ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے اپنے خطوط کی نقول اور بعض حالات میں اصل خطوط اور ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظمیں موجود تھیں۔ غرض حکومتِ وقت کے خلاف بغاوت کا جرم ثابت تھا۔ اور اس کی کم سے کم سزا ملازمت سے برطرفی تھی۔ حکومت چاہتی تو گرفتاری کا حکم بھی دے سکتی تھی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ضلع کے دورے پر کلورکوٹ آئے۔ والد کو انھوں نے اسی ڈاک بنگلے میں طلب کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ یہ اپنے خلاف اتنا سنگین معاملہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں موجود تھیں۔ رادھا کرشن نے صاف الفاظ میں کہا کہ اگر میری جگہ کوئی مسلمان یا انگریز ڈپٹی کمشنر ہوتا تو آپ اس وقت جیل میں ہوتے۔ میں نے محض مذہبی تعلق کی بنا پر سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ اب آپ ایک طرف ہو جائیے۔ یا تو کھلم کھلا کانگریس کی تحریک میں شامل ہو جائیے یا سرکاری نوکری میں رہیے۔ وہ تو یہ حکم دے کر چلے گئے، والد کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں ہوئی۔ لیکن اس سارے واقعے کا ردِ عمل ان پر اچھا نہیں ہوا۔ بے شک رادھا کرشن نے ان پر احسان کیا تھا۔ لیکن والد نے جب بھی اس واقعے کا ذکر کیا بڑے افسوس کے ساتھ کہ وہ نیکی بھی کیا جو تعصب کی بنا پر کی جائے۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے قدردانی کرتے تو ایک بات بھی تھی۔ تعصب کی بنا پر قدردانی کی تو کس کام کی۔ آخر عمر میں جب آپ کبھی اس زمانے کا ذکر کرتے تو اس واقعے کا ذکر افسوس اور اندوہ سے کرتے، اور عیسیٰ خیل کے مرحوم نواب سیف اللہ خاں کا تذکرہ اس موقع پر وہ ضرور کرتے۔ سیف اللہ خاں مرحوم ان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی بغل گیر ہو کر ملتے اور بڑی عزّت سے پیش آتے تھے۔ لاہور میں کسی ملاقات کے دوران میں نواب سیف اللہ خاں سے نواب احمد یار خاں دولتانہ نے یہ کہہ دیا تھا کہ عیسیٰ خیل وہی شہر ہے نا جہاں محروم صاحب رہتے ہیں؟ انھوں نے والد سے اس واقعے کا ذکر کیا

اور کہا کہ آپ تو ہمارے لیے واجب الاحترام ہیں۔ یہاں ضلع بھر میں زمینوں اور جایدادوں کے مالک ہم ہیں، آپ کی حیثیت ایک ہیڈ ماسٹر سے زیادہ نہیں، لیکن ہمارا کوئی نام بھی نہیں لیتا اور ہمارے شہر کا نام آپ کی وجہ سے مشہور ہے۔ آپ کی ذات ہمارے لیے فخر کا باعث ہے۔

کلور کوٹ سے آب ودانہ انھیں راولپنڈی لے آیا۔ بات یہ تھی کہ میں نے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد راولپنڈی کالج میں داخلہ لے لیا۔ والد کلور کوٹ کے ماحول سے بیزار تو تھے ہی، کوشش کرکے انھوں نے بھی اپنا تبادلہ راولپنڈی کرالیا۔ یہاں وہ چھاؤنی بورڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں راولپنڈی میں ادبی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ عبدالحمید عدمؔ یہیں راولپنڈی میں مقیم تھے۔ عطاء اللہ کلیمؔ، عبدالعزیز فطرتؔ، ضیاؔ، اظہر امرتسری یہ سب حضرات بھی یہیں تھے۔ والد راولپنڈی آئے تو شہر کے ادبی حلقوں کی طرف سے ان کا خیر مقدم پرتکلف دعوت کی صورت میں کیا گیا۔ ان کے آنے سے راولپنڈی کی ادبی سرگرمیوں میں نئی جان آگئی اور ان کی اپنی ادبی زندگی بھی زیادہ خوش گوار بن گئی۔ لیکن اسکول کے حالات یہاں بھی دردِ سر ہی رہے۔ کلور کوٹ میں تو ایک ضلع انسپکٹر ہی افسر تھا، یہاں کنٹونمنٹ بورڈ کا ہر ممبر افسر تھا۔ ایک ممبر محمد رفیع کو تو ان سے پہلے دن ہی سے بغض للّٰہی پیدا ہوگیا۔ اس نے انھیں اسکول سے نکلوانے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن ایک اور ممبر محمد جان مرحوم بیرسٹرایٹ لا (سابق جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ) نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ دو ایک ٹیچر محمد رفیع سے مل گئے، جس سے والد کی پریشانیوں میں معتدبہ اضافہ ہوگیا۔ اسکول کے اوقات کے بعد ان کا سارا وقت صفائی کے لمبے لمبے بیانات لکھنے میں ضائع ہوتا رہا۔ چند برس بعد محمد رفیع کا انتقال ہوگیا اور صورتِ حال سکون پذیر ہوگئی۔ یہاں سے آپ ۱۹۳۳ء میں ریٹائر ہوئے اور آپ نے

سی و پنج سالِ عمرم بہ ملازمت بسر شد
سحرِ شباب خود را ہمہ تیرہ شام کردم

شرمم بہ عہدِ پیری چہ بود کہ در جوانی
بہ سگاں ادب نمودم، بہ خراں سلام کردم

کہ کر اطمینان کا سانس لیا۔

فوراً بعد آپ گورڈن کالج راولپنڈی میں اردو اور فارسی کے لیکچرر مقرر ہو گئے۔ مولانا تاجور مرحوم کو اس تقرر کا علم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ تمھارے والد کو جہاں شروع میں پہنچنا چاہیے تھا، وہاں وہ آخر میں پہنچے ہیں۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ اسکولوں میں ان کا وقت تقریباً ضائع ہی ہوا ہے، انھیں شروع ہی سے کسی جگہ اردو اور فارسی کا لیکچرر مقرر ہونا چاہیے تھا۔

یہ تین برس بڑے اطمینان اور سکون سے بسر ہوئے، ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہنگامۂ کشت و خون میں کپتان عبدالمجید (اللہ انھیں ہمیشہ اور ہر جگہ آبرو سے رکھے) نامی ایک فرشتہ خصلت انسان کی امداد سے بخیر و عافیت لاہور پہنچے۔ لاہور سے بہزار دقت امرتسر اور جالندھر آئے۔ میں ان دنوں دلّی میں تھا۔ انھوں نے مجھے خط لکھا کہ "جالندھر تک تو آ گیا ہوں۔ دلّی پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ ہر طرف ایک افراتفری اور کس مپرسی کا عالم ہے۔ یہاں بھی کسی مسلمان ہی سے کام نکلے گا۔" لیکن کوئی مسلمان اس وقت جالندھر میں اس قابل نہ تھا کہ ان کی خدمت کر سکتا۔ قصہ کوتاہ بڑی مشکلوں سے دلّی پہنچے۔ یہاں لالہ دیش بندھو گپتا مرحوم نے "تیج" اخبار میں ان کی ملازمت کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا تھا۔ کچھ مدت وہاں کام کیا، پھر پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دلّی میں لیکچرر مقرر ہوئے، یہاں سے وہ ۱۹۵۸ء میں سبک دوش ہوئے۔ ان کی اس سبکدوشی کی یادگار یہ رباعی ہے۔

محروم یہی ہے عمرِ فانی کا نظام
پیری دیتی ہے سب کو عزلت کا پیام
پیرانِ کہن سال کی محفل میں چلو
کالج کو وداع، نوجوانوں کو سلام

آپ کی طبیعت یوں بھی ہنگاموں سے نفور تھی لیکن کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد تو آپ نے مکمل طور پر گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ صحت اُس زمانے میں اُن کی اگرچہ اچھی نہیں تھی لیکن خراب بھی نہیں تھی۔ صبح کی سیر اور رات کو کھانے کے بعد چہل قدمی ان کا معمول تھا۔ ہاں نظر کسی حد تک کمزور ہوگئی تھی، اس لیے اخبار کا مطالعہ صرف اس کی سرخیوں ہی تک محدود ہو کے رہ گیا تھا۔ اخبار سے یوں بھی انھیں دلی لگاؤ کبھی نہیں رہا اگرچہ ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔

کتابوں کا مطالعہ انھوں نے آخر تک جاری رکھا۔ دیوان بیدل، دیوان ناصر علی اور رُباعیات عمر خیام ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں لیکن آخری برسوں میں ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا جب اُن کی توجہ تمام کتابوں سے ہٹ کر گیتا پر مبذول ہوگئی تھی اور ہر روز وہ اس کا مطالعہ بلا ناغہ کرتے تھے۔ انھوں نے گیتا کا اردو نظم میں ترجمہ بھی کیا ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد حکومتِ ہند نے ادبی خدمات کے سلسلے میں اُن کی پنشن مقرر کردی جو تادمِ زیست جاری رہی۔ اسی دوران میں حکومتِ پنجاب نے بھی اُن کی ادبی خدمات کو سراہا اور ایک عظیم جلسے میں جس کی صدارت گورنر پنجاب نے کی، انھیں گیارہ سو روپے کی تھیلی، خلعت اور سپاس نامہ پیش کیا۔ یہ جلسہ مارچ ۱۹۶۲ء میں منعقد ہوا۔ آپ نے اس موقع پر حکومتِ پنجاب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جو تقریر کی اُس میں پنجاب اور اُردو کے صدیوں پرانے رشتے پر روشنی ڈالی اور اس بات پر زور دیا کہ پنجاب میں اُردو کو اس کا صحیح مقام ملنا چاہیے۔

حکومتِ پنجاب کی اس عزت افزائی کے فوراً بعد انھیں مبارک باد دینے کے لیے دلّی میں متعدد جلسے ہوئے۔ اس سلسلے میں ایک جلسہ دلّی یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں آپ نے اظہار تشکر کے طور پر یہ رباعی پڑھی:

دنیائے کمال و فضل یہ دارِ علوم　　انصافِ جہاں میں آج جس کی ہے دھوم

خود دادِ سخنوری تجھے دیتا ہے   آداب بجالاؤ ادب سے، محروم!

انجمن تعمیرِ اُردو نے بھی ایک جلسہ منعقد کیا، لیکن آپ علالت کی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکے۔ انجمن نے اس موقع پر ایک سپاسنامہ اُن کی خدمت میں پیش کیا۔

گورنمنٹ ایمپلائز ایسوسی ایشن اور بزمِ سخن، موتی باغ نے ایک مشترکہ جلسے کا انعقاد کیا۔ اس جلسے میں آپ نے جو کلام پڑھا اُس میں یہ رباعی آپ کے زندگی بھر کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔

احباب نے جو یہ عزت افزائی کی   تکلیف اٹھا کے جلسہ آرائی کی
میں گوشہ نشین کہاں، کہاں یہ اعزاز   نادم ہوں، قسم ہے کنجِ تنہائی کی!

اُس وقت تک صحت اُن کا بخوبی ساتھ دے رہی تھی، لیکن ۱۹۶۲ء میں انھیں ریاح کی تکلیف شروع ہوئی جو آخر تک ساتھ رہی۔ اگرچہ انھوں نے علاج اور غذا کی باقاعدگی سے اس بیماری کا مقابلہ کیا لیکن اپنے آخری دو ڈھائی برس میں وہ پوری طرح صحت یاب نہیں رہے۔ کبھی صحت اچھی رہی کبھی ریاحی تکلیف کے غلبے سے پریشان رہے۔ لیکن ان کی زندگی میں جو باقاعدگی اور ضبط میں اپنے بچپن سے، دیکھ رہا تھا، وہ اس وقت بھی موجود تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، انھیں صبح کے ناشتے میں دودھ کے ایک گلاس کے سوا کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ اُن کا یہ طریقہ اُس وقت تک جاری رہا جب مرضِ ریاح کے پیشِ نظر ڈاکٹروں نے انھیں دودھ استعمال کرنے سے قطعاً منع کر دیا۔ چائے یا لسی سے انھیں کوئی رغبت نہیں تھی۔ لسی جو ہم اہلِ پنجاب کی قومی غذا ہے، وہ بالکل استعمال نہیں کرتے تھے۔ چائے کے لیے روزِ ابر کا ہونا شرط تھا۔ دودھ کے بعد پھلوں کا نمبر آتا تھا اور پھل کے بارے میں اس قدر احتیاط سے کام لیتے تھے کہ پھل بالکل بے مزہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ ان کے نزدیک پھلوں کا چھلکا بہت مضر چیز تھی اور اس سے پرہیز لازمی تھا۔ چنانچہ اس اصول کے تحت وہ انگور تک کا چھلکا اتار لیتے تھے۔ گھر کے باقی لوگوں کو انگور کھانے کا یہ طریقہ بالکل پسند نہیں تھا۔ اکثر اس امر کی کوشش بھی کی گئی کہ جہاں تک انگور کا تعلق ہے، وہ اسے چھیلنا ترک کر دیں لیکن وہ اپنی وضع پر ہمیشہ قائم رہے۔

شاید انہی باقاعدگیوں کا اثر تھا کہ صحت ان کی بحیثیت مجموعی اچھی رہی لیکن بعض عارضے شروع ہی سے ان کے رفیق بن گئے تھے۔ لڑکپن میں جب تیراکی کا شوق تھا تو دریائے سندھ میں ایک بار گہری چھلانگ لگائی۔ شوق تو پورا ہو گیا لیکن ہرنیا مستقل طور پر زندگی کا ساتھی بن گیا۔ یہ اور اس کے ساتھ عرق النسار دونوں کبھی کبھی بڑی پریشانی کا باعث بن جاتے تھے غالباً یہی سبب تھا کہ دوائیوں کا بکس ہمیشہ ساتھ رہتا۔ باہر کہیں سفر پر جاتے تو دس بارہ دوائیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ نمک، سیاہ مرچ اور شکر وغیرہ شیشیوں میں بند کر کے الگ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مشاعرے میں کہیں جاتے تو تمام شعرا کے لیے ان کی دواؤں کی میز حیرت کا باعث ہوتی تھی۔ دوائیں ساتھ لے کر اُن کی سفر کی عادت شعرا میں بہت شہرت پا چکی تھی۔ ایک دفعہ لائل پور میں مشاعرہ تھا۔ قتیلؔ شفائی اُن سے ملنے آئے۔ جہاں شعرا کا قیام تھا وہاں دو چار کمروں میں وہ گئے۔ والد موجود نہیں تھے۔ ایک کمرے میں میز پر دواؤں کی دس پندرہ شیشیاں رکھی تھیں۔ وہ ان کے انتظار میں وہیں بیٹھ گئے۔ ان کا اندازہ صحیح نکلا، وہی کمرہ والد کا تھا۔

چونکہ والد نے بہت کم عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور ان کی زندگی ہی میں دو نسلیں ان کے کلام سے فیض یاب ہوئی تھیں اس لیے اُن کی عمر کے بارے میں اکثر غلط اندازے ہوتے رہے۔ ایک بار جوشؔ ملیح آبادی لاہور تشریف لائے۔ والد اُن سے ملنے گئے۔ انہوں نے والد کو دیکھ کر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ میں بچپن سے آپ کا کلام پڑھ رہا ہوں اور میرا خیال تھا کہ آپ بمشکل لاٹھی کے سہارے سے چلتے ہوں گے۔ آپ کی عمر کے بارے میں میرا اندازہ حیرت انگیز طور پر غلط تھا۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے اس کے بعد وہ ستر برس کی عمر تک عصائے پیری کا سہارا لیے بغیر باقاعدہ کالج جاتے رہے بلکہ تادمِ زیست آپ نے اس چھڑی کی ضرورت محسوس نہیں کی جو پچپن برس کی عمر میں ان کے ہاتھ میں موجود رہتی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد دلّی آکر اگرچہ انھیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی لیکن مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے ایک ناآسودگی ان کے احساس میں سرایت کر گئی ہے۔ جب تک جوشؔ ملیح آبادی دلّی میں رہے اُن کے ساتھ آپ کا برابر ملنا جلنا رہا۔ جوشؔ صاحب بھی ان سے ملنے اکثر ہمارے گھر آتے تھے، والد زیادہ تر جوشؔ صاحب سے ان کے دفتر ہی میں ملنے جایا کرتے تھے۔ دونوں کی گفتگو کا موضوع بالعموم فارسی شاعری رہتا تھا۔

جوشؔ صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد اُن کا گھر سے نکلنے کا بہانہ بڑی حد تک ختم ہوگیا۔ میں نے اکثر دیکھا کہ وہ اپنے ماحول میں ایک طرح کی تنہائی سی محسوس کر رہے ہیں۔ تنہائی کا یہ احساس اس وقت اور زیادہ ہوگیا جب ہم لوگ پرانی دلّی سے منتقل ہو کر نئی دلّی میں آگئے۔ موتی باغ بھی ملنے جلنے کے اعتبار سے غنیمت تھا لیکن چانکیہ پوری کی کالونی تو بالکل "کسے را باکسے کارے نہ باشد" کی تصویر ہے۔ اس کالونی پر محیط سنّاٹے نے ضرور والد کی طبیعت پر ناخوشگوار اثر ڈالا ہوگا لیکن جس ناآسودگی کا میں نے ذکر کیا ہے اُس کی ابتدا ۱۹۴۸ء ہی سے ہوگئی تھی۔ "پاکستان کو الوداع"، "ساکنانِ دیارِ پاکستان"، "گورڈن کالج راولپنڈی کی یاد"، "لے جا پیام ایک غریب الدّیار کا" اور "دریائے سندھ کی یاد" وغیرہ اسی ناآسودگی ہی کی مختلف جھلکیاں ہیں۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں وہ گورڈن کالج کی گولڈن جوبلی کے مشاعرے میں شرکت کے لیے راولپنڈی تشریف لے گئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد یہ ان کا راولپنڈی کا پہلا اور آخری سفر تھا۔ اس سفر کی یادگار یہ رباعیاں ہیں جن سے اُس تعلقِ خاطر کا اندازہ ہوتا ہے جو انھیں راولپنڈی کی سرزمین سے تھا:

پھر اپنے وطن کی ہے فضا پیشِ نظر
اک عالمِ نو ہے جا بجا پیشِ نظر
گزری ہوئی عمر پھر پلٹ کر آئی
نیرنگِ طلسمات ہے پیشِ نظر

جاں وقفِ الم ہے اور فرحان بھی ہے
دل مائلِ تسکین بھی، پریشان بھی ہے
راولپنڈی میں آ کے محروم حزیں
فریاد کناں بھی ہے، غزل خوان بھی ہے

اے صبحِ وطن تری صباحت ہے اور
رقصاں ہر اک کرن میں طلعت ہے اور
نظّارے سے تیرے آج معلوم ہوا
صبحِ وطن اور، صبحِ غربت ہے اور

راولپنڈی اور لاہور کے احباب کا ذکر جب بھی ان کی زبان پر آیا، ایک کائناتِ درد اپنے ساتھ لایا اور یہی کائناتِ درد ان کی حقیقی کائنات تھی۔ ایک نظم میں کہتے ہیں:

اے کاش مجھ کو پھر نظر آئے وہ سرزمیں   صحرا بھی جس کے صحنِ گلستاں سے کم نہیں
آغاز تھا جہاں مرا، انجام ہو وہیں   اتنا ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں

سودائے خام ایک غریب الدّیار کا

لیکن احبابِ پاکستان کے ساتھ ان کی خط و کتابت زیادہ نہیں رہی، اس لیے کہ باقاعدہ خط و کتابت ان کے مزاج میں نہیں تھی ہاں تخلیقِ شعر سے وہ کبھی غافل نہیں رہے اور یہ سلسلہ آخری دنوں تک قائم رہا۔ اپنے کلام کو کتابی صورت میں مرتّب کرنے کی طرف بھی انھوں نے زیادہ توجہ تقسیمِ ہند کے بعد ہی کی۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ان کے دو مجموعے شائع ہوئے تھے: گنجِ معانی اور رباعیاتِ محروم (کلامِ محروم حصہ اول، دوم، سوم اور مہرشی درشن کے علاوہ) ۱۹۴۷ء کے بعد گنجِ معانی اور رباعیاتِ محروم کے نئے ایڈیشنوں کے علاوہ کاروانِ وطن، بہارِ طفلی، شعلۂ نوا، نیرنگِ معانی، اور بچوں کی دنیا شائع ہوئیں۔ آخر الذکر ۱۹۶۳ء میں چھپی اور اس

پر حکومتِ ہند نے ایک ہزار روپے کا انعام دیا۔

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۶۲ء سے انھیں ریاحی تکلیف نے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ علاج معالجے سے یہ تکلیف عارضی طور پر رفع ہو جاتی تھی، لیکن مستقل طور پر اس سے نجات انھیں نہ ملی۔ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ دل کا مرض نہ ہو، لیکن ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک ڈاکٹروں اور یونانی اور آیورویدک اطبار کی رائے یہی تھی کہ انھیں دل کا مرض نہیں بلکہ ریاح کا مرض ہے۔ چونکہ آثار دونوں امراض کے ایک سے ہوتے ہیں، اس لیے جب ریاحی مرض کی شدت ہوتی تھی تو انھیں گمان یہی ہوتا تھا کہ دل کا مرض پریشان کر رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک علاج کی غرض سے وہ غالباً تین بار تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے ولنگڈن نرسنگ ہوم میں بھی رہے۔ وہ ولنگڈن نرسنگ ہوم کے طریقِ علاج سے بھی مطمئن تھے اور ڈاکٹروں کے حسنِ سلوک سے بھی۔ اس کے علاوہ مختلف اوقات میں حکیم عبدالحمید، حکیم ذکی احمد، حکیم گنگا رام گاندھی اور وید بھٹناگر بھی ان کا علاج کرتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کے آخر میں جب وہ بیمار ہوئے، تو ایلوپیتھک علاج ہی شروع ہوا، لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ چنانچہ کچھ مدت تک گھر میں علاج کرانے کے بعد انھیں ڈاکٹروں کے مشورے سے ولنگڈن نرسنگ ہوم میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں اچھے سے اچھے علاج کے باوجود روز بروز ان کی صحت گرتی گئی اور ایک مہینہ چھ دن کی مسلسل علالت کے بعد ۶؍ جنوری ۱۹۶۶ء کو وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ ؏

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

میں نے اس مقالے میں والد کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ وہ ابھی اسکول کے تیسرے درجہ ہی میں تھے کہ ایک منظوم کتاب مجموعۂ قصص ان کے ہاتھ لگ گئی۔ اس میں چند قصے آسان نظم میں تھے۔ انھیں پڑھ کر خود بخود اسی بحر میں مصرعے موزوں ہونے لگے۔ بعد کو درسی کتب کی نظمیں پڑھ کر واقفیت بڑھنے لگی اور آٹھویں درجے تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں کہنے لگے جو ہم درجہ طلبہ اور ان کے استادوں کے لیے حیرت اور دلچسپی کا باعث ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۱ء (ساتویں جماعت) میں آنجہانی

ملکہ وکٹوریہ کا نوحہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ بھی تھا:

فرطِ غم سے غنچے چپ ہیں گُل گریباں چاک ہیں
نوجوانانِ چمن بھی سر پہ ڈالے خاک ہیں

اس شعر پر قسمت کے انسپکٹر مدارس نے جو ایک دہلوی بزرگ تھے، بہت داد دی۔ اس سے پہلے ایک مثنوی بارش پر کہی تھی، جس کا ایک شعر میرے علم میں ہے ؎

الٰہی تری مہربانی ہوئی
کہ ساری زمیں پانی پانی ہوئی

لامحالہ اس دور کی شاعری ابتدائی تھی اور اردو مادری زبان نہ ہونے کے باعث اس میں زبان کے نقائص بھی تھے، لیکن وزن کی صحت ہر نظم میں برابر قائم رہتی تھی۔

ہائی اسکول میں پہنچ کر شعر گوئی میں زیادہ انہماک ہوگیا، اور دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ایسی نظمیں بھی ہوگئیں جو زمانہ کانپور اور مخزن کے سے بلندپایہ رسالوں میں شائع ہونے لگیں، چنانچہ "چڑیا کی زاری" اور "سندھ کو پیغام" اسی زمانے میں مخزن میں چھپی تھیں۔ منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر زمانہ کانپور سے اسی زمانے میں خط و کتابت شروع ہوگئی تھی اور انھوں نے تعریفی جملوں سے ہر نظم پر ان کا دل بڑھایا۔ شاعری میں کسی سے اصلاح نہیں لی، اور نہ عروض ہی کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ فنِ عروض کے متعلق شروع ہی سے آپ کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ جب تک کوئی قابل استاد نہ ملے اسے حاصل کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے دامن چھڑا لیا:

محرومؔ ہم کو عشق نے شاعر بنا دیا
بے ساختہ زباں سے نکلتی ہے دل کی بات
کرتے رہیں گے مولوی صاحب تمام عمر
مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات

اس قطعے کے بارے میں بعد کو کہا کرتے تھے کہ یہ میری سہل انگاری تھی، ورنہ عروض سے واقفیت کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔

نہ صرف شعر میں ان کا کوئی استاد نہیں بلکہ خود انھوں نے بھی کسی کو اپنا شاگرد نہیں بنایا؛ یوں کسی نے مشورہ چاہا تو بخوشی دے دیا۔ اس قسم کے خطوط لکھنے والوں کو وہ بعض کتابوں کے نام مطالعے کے لیے تجویز کرتے تھے، جن میں بانگِ درا جامِ سرور کلیات داغ اور کلیات امیر مینائی کے نام ضرور شامل ہوتے۔ ان کی رائے میں اول الذکر دونوں کتابیں خیالات میں تنوع اور بلندی پیدا کرنے کے لیے اور آخر الذکر صفائیِ زبان کے لیے بہت مفید ہیں۔ اپنی شاعری کے بارے میں اکثر انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ میں نے شاعری کو نہ تو بطورِ فن حاصل کیا اور نہ اس پر فنّی نظر سے توجہ کی۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

شاعر ہوں، شاعری میں استاد نہیں
گو نقدِ سخن ہے پاس، نقّاد نہیں
سودا کب سے ہے شاعری کا مجھ کو
مدت اتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں

میں نے والد کو شعر کہتے اکثر دیکھا ہے؛ جب طبیعت مجبور کرتی تھی یا کوئی خارجی تحریک رونما ہوتی تھی تو آپ کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک بار آپ جو کچھ لکھ لیتے، وہی اس کی قطعی صورت ہوتی تھی۔ میں نے انھیں کلام پر نظرِ ثانی کرتے نہیں دیکھا۔ گھر میں بچوں کا شور ہو یا غل غپاڑہ۔ آپ کی شعر گوئی کے رستے میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ ہاں کوئی فرمایشی نظم کہنا ہوتی تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ "اہتمام" ضروری ہو جاتا۔ اکثر آپ کاغذ پنسل لے کر گھر سے دور شہر کے باہر چلے جاتے اور وہیں سے نظم ختم کر کے لاتے تھے۔ انھیں فی البدیہہ نظم کہنے کا خاص ملکہ تھا۔ سینکڑوں قطعے اور نظمیں ایسی ہیں جو انھوں نے ارتجالاً قلم برداشتہ کہی ہیں۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی:

یہ علامہ اقبال کا مرثیہ ہے۔ علامہ کے انتقال کی خبر ریڈیو پر سنی، تو انھوں نے اسی وقت ماتم میں اسکول بند کر دیا اور سیدھے گھر آئے، مجھے بتایا کہ اب اقبال اس دنیا میں نہیں۔ پھر فرمایا، دو ایک شعر لکھواتا ہوں، تم انھیں لکھ لو۔ میں نے کاغذ پنسل ہاتھ میں لی، آپ حقّے کے ہر کش پر ایک شعر لکھوا دیتے تھے۔ نوحے کا پہلا شعر یہ ہے:

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا
احساس میں سما گیا، دل میں اتر گیا

جب آپ یہ شعر لکھوا چکے:

کنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر
قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا
کاشانۂ بقا میں مسافر پہنچ گیا
ویرانۂ فنا سے سلامت گزر گیا
باغِ جہاں میں صورتِ گلہائے تر رہا
باغِ جناں میں مثالِ سحر گیا
خاکِ چمن میں گو ہرِ شبنم نہاں نہیں
خورشید جلوہ بار سے پوچھو کدھر گیا
"ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق"
روشن تر اس حقیقتِ روشن کو کر گیا

تو میں نے کہا اس نظم میں آپ "مر گیا" کا قافیہ تو استعمال نہیں کریں گے؟ فرمایا: کیوں؟ میں خاموش ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ "مر گیا" کا قافیہ شعر کو بے جان کر دے گا۔ انھوں نے آخری شعر لکھوایا:

محرومؔ! کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو
یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں نے رائے دینے میں کس قدر غلطی کی تھی۔

دوسرے دن اقبال کے انتقال پر ماتمی جلسے کا پروگرام طے ہوا۔ گورڈن کالج کے ہال میں جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن عین وقت پر کالج کو کوئی ایسی ضرورت پیش آگئی کہ وہ ہال ہمیں نہ مل سکا۔ سارا انتظام مکمل تھا۔ اسے ملتوی کرنا اب ہمارے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ کالج کے قریب میونسپل باغ میں جلسہ منعقد کیا جائے۔ تمام مدعوئین کالج ہال سے ہوکر باغ میں پہنچ رہے تھے۔ والد بھی کالج سے ہوکر باغ میں آئے اور اپنی نظم سے پہلے مقام جلسہ کی تبدیلی پر یہ شعر پڑھا ؎

بلبلِ گلزارِ معنی بود آں رنگیں سخن
ماتمِ اقبال باید کرد در صحنِ چمن

بدیہہ گوئی کا جو ملکہ انہیں حاصل تھا، اسے دیکھ کر اُردو اور فارسی کے پرانے کلاسیکی شعراء کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ انتقال سے دو دن قبل ایک مقامی ماہنامے کے مدیر اُن کی عیادت کو آئے اور اُن سے تازہ کلام کی فرمائش کی۔ آپ نے دو ایک منٹ توقف کیا اور یہ شعر انہیں لکھوا دیا:

محروم آج عالمِ فانی سے چل بسا
مانگو یہی دعا کہ خدا مغفرت کرے

یہ اُن کا آخری شعر ہے اور اس کے ساتھ ہی اردو شاعری کا وہ آفتاب غروب ہو گیا جو اس صدی کے ساتھ ہی طلوع ہوا تھا اور جس سے برصغیر ہند و پاکستان کی کئی نسلوں نے روشنی بھی حاصل کی اور گرمی بھی۔

●●

تصانیفِ محرومؔ

گنجِ معانی ۔ مجموعۂ کلام : ۱۹۳۲ء، ۱۹۵۷ء

رباعیاتِ محروم : ۱۹۴۷ء، ۱۹۵۴ء

کاروانِ وطن ۔ قومی اور وطنی نظموں کا مجموعہ : ۱۹۶۰ء

بہارِ طفلی ۔ بچّوں اور لڑکوں کے لیے نظمیں (با تصویر) : ۱۹۶۰ء

نیرنگِ معانی ۔ غزلیات و منظومات : ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۴ء

شعلۂ نوا ۔ غزلیات کا مجموعہ : ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۵ء

بچّوں کی دنیا ۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے نظمیں : ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۷ء

انتخابِ کلامِ محرومؔ ۔ ساٹھ سالہ کلام کا انتخاب : ۱۹۶۳ء